مصنفہ
حضرت محترم جناب مولانا راشد الخیری صاحب دہلوی
مصنف صبح زندگی۔ شام زندگی۔ منازل السائرہ
صالحات۔ الزہرا۔ طوفان حیات وغیرہ
سنہ ۱۹۲۵ء
دارالاشاعت پنجاب لاہور

ہٹ دھرمی اور بات کی پیچ کا تو علاج نہیں۔ افضل علی خاں جو چاہے سو کہہ لے۔ اس کی بدنصیبی قابل رحم۔ اُس کی مصیبت لایق ہمدردی۔ اس کا رونا درست اس کی شکایت بجا۔ مگر ایمان کسی کے واسطے نگلا نہیں جاتا۔ اور منہ پر آئی رُکتی نہیں۔ زائرہ کے انجام کا سر سے پاؤں تک۔ اور ابتدا سے انتہا تک لاریب سارا بار افضل کی گردن پر ہے۔ یہ ٹھیک کہ بیوی کی صلاح۔ بچوں کی ترغیب اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوئی۔ مگر منہ تھا۔ منہ پر آنکھیں۔ دماغ تھا۔ دماغ میں عقل۔ دیکھ سکتا۔ اور سمجھ سکتا تھا۔ کہ انتظام کے پیغام کا انجام۔ خدیجہ کی درخواست کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہاں سونے چاندی کے انبار۔ دولت کے پہاڑ۔ روپے کی ریل پیل تمول کی افراط۔ یہاں میاں افضل کی ساری کائنات پچاس روپیہ کی پنشن + اختلاف مذاق اور مخالف تربیت سب طاق میں رکھو۔ ظاہری مقابلہ ہی شیر اور بکری ہاتھی اور چیونٹی کا تھا۔ کجا ننوا تیلی۔ کہاں راجہ بھوج۔ یہ سنجوگ پورا ہوتا تو کیونکر۔ اور انجام بخیر ہوتا تو کیسے؟ افضل متفق ہو یا نہ ہو۔ اور سعیدہ اس کی بیوی بُرا مانے تو مانا کرے۔ ہماری رائے میں زائرہ اور نصیر کا نکاح گاڑھے میں کمخواب لپٹے میں ململ۔ اور بنگال میں پنجاب کا پیوند تھا۔

زائرہ مر چکی۔ ہم کو معلوم ہے۔ کہ اس کی موت بہنوں کو دیوانہ اور بھائی کو سودائی بنا گئی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بڈھا باپ جب تک زندہ ہے۔ خون کے آنسو روئے گا۔ مگر ہم پھر یہ ہی کہیں گے۔ علی الاعلان کہیں گے۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہیں گے۔ مسلمان چاہے کافر کہیں یا مرتد کہ لاکھ موت کا وقت مقرر اور ساعت

رحلت اٹل ہو۔ مگر زائرہ کی جان افضل کے لالچ پر قربان ہوئی + اس کو بروں کی کمی
نہ تھی۔ سب پر خاک ڈالو۔ ایک توصیف ہی کا پیغام لے لو۔ صورت شکل کا اچھا
خاندان کا اعلیٰ۔ مزاج کا درست۔ عادت کا ٹھیک۔ ایف۔ اے پاس۔ بی اے
کا ساعی۔ زائرہ جیسی بیوی کے جس نے جاہل شوہر۔ مغرور ساس اور بدمغ
سسرے تک کے پاؤں دبائے۔ سر گوندھنے اور پنکھا جھلنے میں دریغ نہ کیا۔
عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ مگر تنصیبر کا نہیں اس کے والدین کا تمول پردہ بن کر
افضل کی عقل پر پڑا اور دولت پر اندھا بن کر گرا۔ اور دو ہزار کے چڑھاوے پر
بھاڑ میں بیٹی جھونکی + ہم افضل کے زخم پر اب نمک چھڑکنا نہیں چاہتے۔ لیکن
ضرورت ہے کہ اس کی داستان دوسروں کے لئے سبق۔ پڑھنے والوں کو نصیحت اور
سننے والوں کو عبرت ہو + اس کو اور نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ساتھ بیوی اور ان
بچوں تک کو جو نکاح زائرہ کے وقت ہوشیار اور صلاح کار تھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ
بھائیوں نے بہن کو۔ بہنوں نے ماں جائی کو۔ کمبخت ماں نے کلیجہ کے ٹکڑے کو اور
بدنصیب باپ نے معصوم چڑیا کو دولت کی دیوی پر بھینٹ چڑھایا + ہمارا
سچا ہو یا جھوٹا ہماری رائے صائب ہو یا نادرست۔ مگر آج ہم ڈنکے کی چوٹ
کہتے ہیں۔ کہ افضل جو اس وقت بیٹی کو رو رہا ہے۔ قیامت کے روز
مواخذہ میں گرفتار ہوگا اس نے ایک زندہ روح۔ ایک بے زبان
بھولی لڑکی کو جو اس کے قبضہ میں تھی۔ مالداروں سے اس بے دردی اور
ذبح کروایا۔ کہ سارا کنبہ الامان اور الحفیظ پکار اُٹھا + بے ایمانی ہوگی۔ اگر اس
موقع پر اسلم کی مخالفت نظر انداز کر دی جائے۔ وہی ایک اکیلا شخص تھا جس نے
باپ کو سمجھانے اور ماں کو بتانے میں کسر نہ کی۔ اور کھلم کھلا باپ کے روبرو
ماں کے سامنے۔ بہنوں کی موجودگی۔ اور بھائیوں کے علم میں کہہ دیا۔ کہ یہ دولت

آفت۔ اور یہ ثروت مصیبت لائے گی۔ جہالت کے کرشمے خالی اور امارت کا زعم بیجا نہ جائے گا۔ مگر نقارخانہ میں طوطی کی آواز سنتا کون تھا۔ دونوں نے اس کان سنا اور اُس کان اڑا دیا۔

(۱)

افضل کہنے کو تو اگلے ہی زمانہ کا آدمی تھا۔ مگر ادھر تو انگریزی کی تعلیم معقول ادھر نوکری ملی تو ایسی کہ ہر وقت انگریزوں سے ملنا۔ ادیبوں کا ساتھ۔ نہ تو لکیر کا فقیر تھا۔ نہ جدّت کا دلدادہ۔ نماز بھی پڑھتا تھا۔ اور کوٹ پتلون بھی پہنتا تھا۔ تعلیم نسواں کا حامی یوں تو وہ شروع سے ہی تھا۔ مگر پہاڑ پر پہنچ کر جو میموں کا رنگ دیکھا۔ تو مصمم عہد کر لیا۔ کہ جب تک ہر لڑکی زیور تعلیم سے پوری طرح آراستہ نہ ہوگی شادی نہ کروں گا۔ لیکن پردیس کا رہنا۔ دُور کی بات۔ آپ باہر بچے شہر میں۔ وہ عہد پورا ہوا نہ تعلیم کی قید۔ بڑی اور منجھلی دونو بیاہی گئیں۔ نو نہ تو منشی فاضل تھیں نہ کھوٹ جاہل۔ ہاں پنشن لے کر آیا۔ تو کام نہ کاج۔ جانا نہ آنا۔ ایک زائرہ ہی نداں ہو رہی تھی۔ اسی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ باپ کا مشغلہ طبیعت۔ بیٹی کی تعلیم و تربیت۔ اور چھوٹی کی خواہش۔ بیٹی کا شوق۔ باپ کا ارمان۔ بیٹی کا میلان۔ رات کے سات آٹھ انجام بجے ن سے تو وہ تو مجبور تھے۔ ورنہ دن ہو یا رات وہ پڑھا رہا ہے۔ یہ پڑھ رہی ہے وہ ناک رہ سنا رہا ہے۔ یہ سن رہی ہے۔ دو نہیں خاصے ڈھائی پونے تین سال اسی میں ہنسی بسر ہوئے۔ افضل بڈھا پھونس نہ سہی۔ بچّہ بھی نہ تھا۔ بیوی کا شوہر اولاد کا باپ۔ اور گھر کا مُنڈھ۔ اور پھر آدمی اس رعب داب کا کہ جوان لڑکے اور بیاہی بیٹیاں آواز سے کانپیں۔ اور نام سے تھرّائیں۔ رائے کا پُورا۔ دُھن کا پکّا۔ اور ذہن کا کامل تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس کے آگے دم مارتا۔ اور کس کی ہمت تھی کہ اس کے کام پر معترض ہوتا۔ شام کے وقت جب دُنیا اپنے کاروبار سے فراغت

پاکر آرام کی نیاریاں کرتی۔ اور رات کا سایہ روئے زمین پہ پڑ جاتا۔ تو ایک دو دفعہ
نہیں بارہا افضل بچی کو جبر قع اُڑھا کر باہر نکل جاتا۔ تازہ ہوا کھلاتا سیر دکھاتا لاؤ
چلا آتا۔ لوگوں نے اعتراض کئے۔ عزیزوں نے نام رکھے۔ کنبہ والوں نے نکو
بنایا پڑوسیوں نے چہ میگوئیاں کیں۔ مگر افضل جس کا نام تھا۔ اُس نے مطلق پرواہ
نہ کی۔ کچھ رفتار زمانہ کا اثر۔ اور تعلیم جدید کی رَو۔ کچھ باپ کے خیالات۔ اور صحبت
کا نتیجہ۔ زائرہ باپ کی طرح پیکر مشرقی میں غرب کی دلدادہ تھی۔ نماز کی پکّی۔ روزہ
کی پابند۔ بات کی سچّی۔ مزاج کی اچھّی۔ افضل کی چھوٹی بچّی۔ کنبہ بھر کا مول اور
ہیرا تھی۔ کہ چھوٹے سے بڑے تک اور امیر سے فقیر تک۔ سارا کنبہ۔ پورا محلہ تمام
خاندان اس کا کلمہ پڑھ رہا تھا اب یہ خدا جانے کہ تربیت تھی یا فطرت۔ مگر حالت یہ
تھی۔ کہ کنواری بچّی۔ باپ کی دست نگر۔ اور ماں کی محتاج۔ بیکسوں کی ہمدرد۔ اور
مظلوموں کی خاک پا تھی۔ نخوت و تمکنت جو حیات انسانی کا شعبہ بدترین سمجھا جاتا
ہے۔ اس میں ضرور موجود تھی۔ مگر محل جائز اور موقعہ مناسب پر۔ وہ ہمیشہ ہمچشموں
میں خوددار اور ہمجولیوں میں ممتاز رہی۔ امیروں سے اکڑ کر ملی۔ اور برابر والوں
سے تن کر بولی۔ مگر حاجتمندوں سے جھک کر اور غریبوں سے بعزت پیش آئی۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ادھر تو باپ سبق دے کر عصر کی نماز کو گیا۔ ادھر اس
کی اپنی کھلائی۔ اور اپنی ہی نہیں۔ وہ دوا جس نے پانچوں بہن بھائیوں کو پالا
ماں کو دُلہن دیکھا۔ باپ کا بچپن دیکھا۔ دادا کی آنکھیں دیکھیں۔ دادی کو دودھ
پلایا۔ بلبلاتی ہوئی آئی۔ اور کہا کہ "میرے پیٹ میں کون چمٹ گیا۔ خدا کیواسطے
دیکھو تو سہی۔ میری جان نکلی جا رہی ہے"۔ دیکھتے ہیں تو خاصا ڈیڑھ بالشت
کا کنکھجورا سب اینچ پینچ گڑا گئے لپٹا ہوا ہے۔ عورتیں کبھی تھیں اور لڑکیاں
بھی۔ ہوشیار بھی اور نادان بھی۔ سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ کسی نے ڈاکٹر کی صلاح

دی۔ کسی نے کہا۔ باہر مردانہ میں جا۔ بڑھیا کا یہ حال کہ یا تو ایک چیخ آسمان
تھی۔ اور ایک زمین۔ یا تکلیف کے مارے بیہوش ہو کر گر پڑی۔ چہرہ ہلدی
کا کپڑا۔ بدن پسینے پسینے۔ زاہرہ لپک کر اُٹھی۔ اور دست پناہ چولھے میں رکھ
جلد ہی سے دہکتا ہوا سُرخ انگارا کر لے آئی اور اس صفائی سے بدن بچا کر
کگر رکھی۔ کہ کنکھجورا اپنے پنجے نکال چلتا ہوا + کنکھجورے کا الگ ہو کر زمین پر
گرنا تھا۔ کہ زاہرہ نے کچومر کر دیا + اتنے میں افضل بھی آ گیا۔ اور ساری واردات
سُنی۔ بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔ اور کہنے لگا "بیٹی تم کو وقت پر خوب سوجھی! ہم کو
تو خبر ہی نہ تھی۔ کہ یہ ترکیب بھی ہوا کرتی ہے" زاہرہ ہنسی اور کہا "آپ ہی نے
مجھ کو پڑھایا تھا۔ مجھے اس وقت اس کا خیال آ گیا۔ ابا جان! اوسان قائم رہیں
تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے"

زاہرہ کا کوار پتہ ایک پھول تھا جس کی خوشبو نے بہت سے دماغ مہکا
دیئے ایک شمع تھی جس کی روشنی سے گھر ہی کے نہیں۔ آس پاس کے در و دیوار
جگمگا اُٹھے + اس کی رائے اکثر معاملات میں اتنی درست ہوتی ہے۔ کہ ماں اور باپ
دونوں حیران رہ گئے۔ اس کا خیال بعض باتوں میں یہاں تک ٹھیک نکلا ہے۔ کہ
بڑی بہنیں اور جوان بھائی ششدر رہ گئے + چھ روپیہ ماہوار ناشتے کے واسطے
باپ دیتا تھا مگر وہ مشکل سے ایک یا ڈیڑھ روپیہ اُٹھاتی۔ کچھ اس لئے نہیں کہ
کنجوس تھی۔ بلکہ اس لئے کہ نامعلوم کس وقت کوئی ضرورت پیش آ جائے۔ باپ لکھ لُٹ
اور ماں دریا دل۔ مہینہ کے آخری دنوں میں پیسہ پاس نہ ہوتا۔ اس وقت وہی قرض
دیتی اور کام چلتا + ایک دن ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر جا نماز تہ کر رہی تھی۔ کہ ماما روتی
ہوئی آئی۔ اور ماں سے کہا "رات کو ہم سب تو اپنے اپنے دھندوں میں رہے چھوٹی
بچی چولھے پر سے جلتی ہوئی ڈبیا اُٹھا لائی۔ کرتہ ململ کا تھا بچی تیسرے برس میں

ہے۔ لو لگ گئی۔ کُرتہ بھر بھر ہُوا۔ اور شعلوں سے بدن کی چربی نکل آئی بڑی مشکل سے آگ بجھائی۔ بچی رات سے بے شرت پڑی ہے۔ اب ڈاکٹر کے ہاں لے جاؤں گی مہینہ میں دو دن باقی ہیں۔ چار روپے میری تنخواہ کے اور چھ روپے اور دیدو شاید اسی بہانے اللہ اس کو بچا لے نہیں تو بچی ہاتھ سے گئی تو ہے ہی "

مہینہ کا آخر تھا۔ بیوی کی کل کائنات ایک روپیہ تھا۔ اور دو دن کاٹنے میاں مجبور اور بیوی معذور۔ زبانی ہمدردی دونو نے کی۔ مگر روپیہ سے انکار کر دیا۔ اور انکار کرنا ہی تھا۔ چوری تو کرنے سے رہے + یہ خدا جانے کہ ہوتا تو کیا ہوتا دیتے یا نہ دیتے۔ مگر اس وقت تو ٹکا سا جواب دے دیا۔ تین سال کی کھیلتی مالتی بچی ماما کا کلیجہ نکلا جا رہا تھا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر اور جہان سیاہ تھا۔ دل میں درد آنکھ میں آنسو۔ زبان پر آہ۔ جواب سُن کر ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور حسرت سے مُنہ تکتی روتی ہوئی چلی + دروازے تک پہنچی ہو گی۔ کہ پیچھے پیچھے زائرہ گئی۔ اور چپکے سے دس روپے اس کی مٹھی میں دے دیئے۔ ماما نہال نہال دُعائیں دیتی چلی گئی +

گھر کے جھگڑوں سے افضل ہمیشہ الگ تھلگ رہا۔ بیوی سفید و سیاہ کی مالک تھی۔ اور گو اس کے خیالات بہت کچھ اصلاح پر آ چکے تھے۔ مگر پھر بھی ابھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی۔ نواسے کی۔ یہ سمجھ کر کہ جو اُٹھے گا وہ آ جائے گا۔ خواہ مخواہ بسم اللہ کی شادی رچا بیٹھی۔ تنخواہ آئی ہوئی تھی۔ دقت نہ ہوئی۔ اور مہمان جمع ہو گئے۔ زائرہ اور افضل دونو باپ بیٹی نہ اس خیال سے متفق تھے۔ نہ صلاح میں شریک۔ خاصی اچھی شادی اور مزے کا مجمع ہو گیا۔ شام کے وقت جب بیبیاں چلنے کو تھیں تو عصر پڑھ کر زائرہ نے سب بیویوں کو بٹھا اُن کے سامنے یہ مختصر سی تقریر کی :-

بچّے ماں باپ کو ہر ملک۔ ہر قوم۔ ہر مذہب اور ہر فرقے میں دُنیا کی ہر نعمت
سے زیادہ عزیز رہتے ہیں۔ اور جب تک دنیا کا موجودہ انتظام قائم ہے رہیں گے
یہ والدین کا اولاد پر کچھ احسان نہیں۔ بلکہ وہ قدرتی محبّت ہے۔ جو ہر رنگ میں پہنچ
کر خدا کی زبردست حکمتوں کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ تعلق کسی مذہب یا ملک پر
کیا کسی خاص ذی رُوح تک بھی محدُود نہیں۔ آدمی اس میں گرفتار۔ جانور اس
میں مُبتلا۔ امیر کو اگر اپنا بچّہ ہفت اقلیم کی دولت سے زیادہ ہے۔ تو فقیر کو اپنا
لعل امیر کے بچے سے کم نہیں۔ ماں اگر اپنے بچّے کو دُودھ پلا کر باغ باغ ہوتی
ہے۔ تو چڑیا اپنے بچہ کو بھرا کر بھی اس ماں سے کم خوش نہیں ہوتی۔ موت پر اگر وہ
ماں جس کا جوان بشیر بچھڑتا ہے چیخیں مار کر واویلا کرتی ہے۔ تو چیل کے جھپٹے
پر چڑیا بھی چیں چیں سے گھر سر پر اُٹھا لیتی ہے۔ لیکن انسان اس فاختہ کی طرح
جو بچّوں پر گریہ وزاری کرتی ہوئی خود بھی شکرے کا شکار ہو جاتی ہے۔ زہر
کھاتا ہے۔ نہ کنوئیں میں ڈوبتا ہے۔ مگر کیوں؟ اس لئے کہ وہ اشرف المخلوقات
ہے۔ اور عقل سے کام لیتا ہے جس نے اس کو انسان بنا دیا۔ آدمی بھی اگر
اُلفت سے دیوانہ اور محبّت میں اندھا ہو کر جان کھو دے۔ تو جانور میں اور
اس میں فرق نہیں ہے۔

"کسی صاحب عقل قوم نے اولاد کے یہ معنی نہیں سمجھے۔ کہ اس کی محبّت پر
فریفتہ ہو کر ہوش و حواس قربان دے۔ یہ فخر صرف ہم مسلمانوں ہی کو حاصل ہے۔
اور آج کی یہ تقریب جو بسم اللہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس سلسلے میں آپ
سب نے تکلیف فرمائی۔ میرے دعوے کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ روپیہ جو آج کی
تقریب میں صرف ہُوا۔ بظاہر نہایت خوشگوار۔ بیحد با محل۔ اور بہت کچھ با موقع
معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہماری کھلی ہوئی نادانی۔ علانیہ غلطی۔ اور یقینی کوتاہ اندیشی

ہے + خدا میرے ابا جان کی عمر دراز کرے۔ اماں جان کا سایہ ہمارے سر پر ہمیشہ قائم رہے۔ میرا چھوٹا بھانجہ جو اس وقت ڈیڑھ لما بنا ہے کرڑوں نیم سے بڑا۔ لیکن ہمارے سامنے اس روپیہ کے صرف کی بہت سی ضرورتیں اس ضرورت سے بہتر اور اس موقعہ سے بڑھ کر موجود ہیں۔ ہماری بیسیوں رانڈیں سینکڑوں یتیم اس کڑکڑاتے جاڑے کی پہاڑسی راتوں کو سکڑ سکڑ کر صبح کرتے ہیں۔ پہننے اوڑھنے والیاں ننگی رہتی ہیں۔ اور کھانے پینے بچے بھوکے سوتے ہیں + چار ساڑھے چار من بریانی یتیمین تین چار گھنٹے میں ختم ہوگیا۔ حقّے بجرے بیٹے خاطر مدارات ہوئی۔ مگر ایک دانہ اس مالک حقیقی کو نہ دیا گیا جس نے ہم کو یہ خوشی کا دن دکھایا۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم اپنے قصوروں کی معافی مانگیں۔ رحم وکرم کی ملتجی ہوں۔ اور عفو تقصیر کی طالب۔ بہنوں ہاتھ اُٹھاؤ۔ میری التجا میں شریک ہو اور میری دُعا پر آمین کہو +

"گرمی کی چل چلاتی دھوپ اور آفتاب و ماہتاب کی روشنی میں جہاز کے مسافروں کی گریہ وزاری اور رات کی تاریکی میں پہاڑ کی دراڑ سے چیونٹی کے پاؤں کی آواز یکساں سُننے والے سمیع و بصیر" ایک گنہگار لونڈی۔ ایک نابکار کنیز۔ تیری سرکار میں تیرے دربار میں۔ تیرے کرم کی طالب۔ تیرے رحم کی ملتجی ذلیل وخوار۔ نادم وشرمسار حاضر ہوئی ہے۔ زمین وآسمان کے مالک جنگل و بیابان کے بادشاہ۔ انسان وحیوان کے رازق۔ کوہ ودریا کے مالک تیرا نام بڑا۔ تیرے کام بھلے۔ تیرا رحم وسیع۔ تیرا کرم عمیق۔ میری فریاد کو پہنچ۔ میری التجا کو سن۔ مولا میرے۔ میرے رزق میں برکت۔ میرے گھر پر رحمت۔ میرے باپ پر شفقت۔ میری ماں پر عنایت۔ خشکی وتری کے شہنشاہ۔ میری بہنوں کو ثروت۔ میرے بھائیوں کو دولت۔ الٰہی ہماری عزت بچا۔ ہماری آبرو رکھ

غفور رحیم تو کریم ہے۔ تو علیم ہے۔ پناہ دے۔ دوجہاں کے سرتاج۔ پناہ دے۔ دنیا کی پریشانی سے۔ آفت ناگہانی سے۔ محفوظ رکھ ربّ دوعالم محفوظ رکھ قرض کی بلا سے۔ تکلیف کی انتہا سے مصیبت کی ابتدا سے۔ عطا کر مولا عطا کر اپنی محبّت۔ غیر سے نفرت۔ شیطان سے عداوت۔ دے رب العالمین دے جلوہ ایمان دے۔ نور اسلام دے۔ جی کو سکھ۔ آنکھوں کو چین۔ عمر میں برکت۔ عضا میں ہمّت۔ دل کو فرحت۔ روح کو راحت۔ میری التجا قبول۔ میری دُعا منظور صدقہ اپنی خدائی کا طفیل اپنے حبیب کا۔"

بات کہنے کو معمولی تھی۔ دُعا ختم ہوئی۔ اور جلسہ برخاست۔ مگر زائرہ کا سکّہ بڑے سے چھوٹے تک سب کے دل پر بیٹھ گیا۔ بلکہ افضل کی حقیقی بہن نے تو بھائی سے صاف کہہ دیا " اللہ بچّی کو نظر بد سے بچائے۔ ماشا اللہ مینا بول رہی تھی۔ باتیں کیا پھول جھڑ رہے تھے۔ ہر لفظ کلیجے کے اندر اور دل کے پار۔ اللہ عمر میں برکت دے۔ اور تم دونو کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ لڑکی کیا اُستانی ہے کہ سارا گھر کلمہ پڑھ رہا تھا۔ ہمارے تو کنبے بھر میں ایسی ہوشیار بچّی نہیں ہوئی۔ میں تو بیٹھی اِس کا منہ تک رہی تھی۔ کہ کل کی لونڈیا آج بڑوں بڑوں کے کان کتر رہی ہے۔"

(۳)

زائرہ کی سہیلی قدسیہ جس کی شادی کو دو سال کے قریب ہو چکے تھے کوار پنے میں اس کے نام کی دیوانی تھی حقیقی ماموں زاد بہن۔ دیوار بیچ گھر۔ ایک عمر۔ ایک مزاج۔ ایک عادت۔ ایک خصلت۔ دونو کی کچھ ایسی میزان پٹی تھی۔ کہ اگر دم بھر بھی وہ اس کو یا یہ اس کو نہ دیکھتی۔ تو دونو کی دونو بے چین ہو جاتیں کوار پنتہ بے فکری کے دن۔ آزادی کا زمانہ۔ خوب نبھی اور اچھی گزری۔ مگر جب دُنیا نے شادی کا خوشنما بُرقع اُڑھا کر قدسیہ کو جُدا کیا۔ تو زائرہ کے دل کا خُدا حافظ

تھا + جو دونوں ساتھ اور ہزاروں پاس رہی۔ اب وقت اس کو کالے کوسوں مدراس لے جا رہا تھا۔ تڑپی بھی۔ بے چین بھی ہوئی۔ رنج بھی کیا۔ اور روئی بھی۔ مگر جانتی تھی۔ کہ یہ راستہ لازمی۔ یہ سفر ضروری۔ اور یہ گھڑی اٹل ہے۔ جو مرحلہ آج قدسیہ کے واسطے ہے۔ وہ کل میرے لئے + ضبط کیا۔ صبر کیا خاموش ہوئی۔ مگر عمر بھر کا ساتھ گھرے تعلقات۔ جس وقت قدسیہ وداع ہوئی ہے۔ اور دونو بہنیں گلے مل پھوٹ پھوٹ کر روئی ہیں۔ تو دو لھا تک کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ قدسیہ کا شوہر احسان دوسرے ماموں کا بیٹا بھائی تھا زائرہ پالکی کے پاس کھڑی تھی۔ مگر وفور محبت میں کہہ اُٹھی۔

"بھائی احسان اس پھول کی قدر کرنا"

قدسیہ مدراس پہنچ کر جہاں احسان نوکر تھا۔ روزانہ تو نہیں۔ مگر ہفتے میں دو دو تین تین خط زائرہ کو لکھتی رہتی + خوش نصیبی تھی یا بد نصیبی۔ اس کا فیصلہ تو خود قدسیہ کرے یا اس کے عزیز۔ مگر مختصر یہ کہ دو سال میں وہی قدسیہ جو زائرہ کے ساتھ کھنڈروں میں کودتی اور انگنائی میں چھلانگیں مارتی پھرتی تھی۔ دو بچوں کی ماں بن گئی + احسان کی نگاہ پہلے ہی بچہ کے بعد بیوی سے پلٹ چکی تھی۔ وہ پھنسی پرین رہن میں ان کی خدمت میں آیا فرق۔ دیوانگی اور فریفتگی جس کا ہمیشہ دعویٰ تھا پائدار نہیں دودھ کا اُبال تھا۔ صاف پلٹ گیا پھر بھی غنیمت تھا۔ کہ دس گیارہ بارہ بجے باہر سے منہ اوندھائے یا گلے پھیلائے آیا اور پڑ رہا۔ مگر دوسری ولادت تو خدا معلوم آفت ناگہانی تھی یا مصیبت موعودہ ایسا بگڑا کہ خدا کی پناہ + حقوق نسواں کے معاملہ میں مسلمان نکاح ثانی کے حافظ ہیں۔ اور چینک مٹک ڈھونڈ جنے والی آنکھیں عصمت کی ان دیویوں کے اس وقت کی جب وہ شخص ان کی بدولت اس درجہ کو پہنچ جاتی ہیں۔ کہ

سر کا ہوش ہوتا ہے۔ نہ مُنہ کا۔ ایک معصوم رُوح کلیجے سے چمٹی ہوتی ہے بجائے قدر کرنے کے تذلیل اور تضحیک کرتے ہیں + احسان بھی ہندوستان ہی کا مُسلمان تھا۔ وہ کیوں مستثنےٰ ہوتا؟ دوسرے بچّہ کا ہونا تھا۔ کہ بیوی سے شیطان کی طرح ہزاروں کوس دُور بھاگ گیا +

ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ جفا شعار آدھی رات کے وقت گھر سے باہر تھا اور بدنصیب قدسیہ دونوں بچّوں کو لئے مکان میں اکیلی + بچّے سو چکے تھے۔ احسان کی بے اعتنائی کا تصوّر بندھا اور خیال آیا۔ کہ کیسی پھوٹی تقدیر۔ اور ذلیل مقدر لے کر آئی تھی۔ جس شخص سے عمر بھر کا واسطہ تھا۔ وہ دو ہی سال میں صورت سے بیزار ہو گیا۔ پہاڑ سی عمر کاٹنی اور پورا زمانہ بسر کرنا ہے۔ میں وہی ہوں۔ عادت وہی۔ مزاج وہی خصلت وہی صورت وہی۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلے دُلہن تھی۔ اب نوکر ہوں۔ اس وقت بیگم تھی۔ اب لونڈی ہوں۔ ابھی سیر میں پونی بھی نہیں کتی کے آدمی کے پیر بشری۔ میری حالت دن بہ دن بدتری کی ہے۔ بہتری کی نہیں۔ مگر میں کہاں سے قصوروار ٹھہری۔ یہ تو دُنیا کا دستور اور زمانہ کی رفتار ہے۔ بڑی بھابی جان کے ہاں نہ ہوا تو سب نے یہ آفت مچائی۔ کہ بانجھ ہے۔ نگوڑی ناٹھی ہے۔ نوج اس کا پرچھاواں پڑے خدا اُس کا منہ نہ دکھائے۔ میرے ہاں ہوگئے تو یہ سزا ملی۔ کہ پردیس میں آدھی رات کے وقت جان نہ پہچان۔ اس سنسان مکان میں ٹھڑوں ٹوں اکیلی پڑی ہوں۔ احسان سے مہربانی کی توقع اب فضول۔ اور عنایت کی اُمید بیکار۔ یہ ہی کیا کم ہے۔ کہ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا۔ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا دے رہا ہے۔ یہ بھی نہ دے تو کیا کروں؟ خیر۔ مگر ان باتوں کا انجام۔ اس غفلت کا نتیجہ ہوگا کیا۔ بھلا غضب خدا کا۔ چوکی دار بولنے لگے۔ رات سائیں سائیں کر رہی ہے

بچے اللہ رکھے سو گئے۔ کب تک کنواری کھوئے بیٹھی رہوں۔ کھانا تین دفعہ گرم کر چکی ہوں۔ خیر اس کی خوشی جس حال میں رکھے مالک۔ اور جو سلوک کرے مختار۔ میں فرماں بردار ہوں۔ خدمت کروں گی اور پیٹ پالوں گی۔

یہ جھگڑا بند ہوتے ہی عمر گذشتہ کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی۔ اور کوار پنے کا وہ زمانہ جب ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں آماں۔ بہنوں سے خوشامدیں کروائیں یاد آ گیا + مقابلہ کیا۔ تو ایک وہ وقت تھا۔ کہ ذرا بگڑی کھانا نہ کھایا۔ تو گھر بھر بھوکا بیٹھا ہے۔ ایک یہ دن تھا کہ چار وقت بھی نہ کھائے۔ تو پوچھنے والا تک نہیں + ان ہی الجھنوں میں پڑی ہوئی تھی۔ کہ قدسیہ کی بدنصیبی پر آسمان نے لباس سیاہ پہنا۔ کالی گھٹا چھا گئی۔ اور مینہ برسنا شروع ہوا + ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ مینہ دھائیں دھائیں پڑ رہا۔ اور کواڑ دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ دل فنا ہو رہا تھا خوف کے مارے جان نکلی جاتی تھی + ارادہ کیا کہ دروازہ بند کر آؤں + مگر پھر خیال آیا۔ کہ آ گئے۔ آواز دی۔ نہ سنی۔ تو بھیگیں گے + کھڑی ہو گئی ذرا سا کھٹکا جان پر بنا دیتا تھا۔ کہیں تین بجے رات کے احسان بھیگتا بھاگتا آیا تو جلد ہی جلدی اس کے کپڑے بدلوائے۔ کھانا گرم کر رہی تھی۔ کہ پہلے چھوٹا اور چھوٹے کے روتے ہی بڑا اٹھ بیٹھا + ڈر گئی۔ کہ دیکھئے کیا عزت لوٹتی ہے پہلے ہی کہتے ہیں۔ کہ ان کمبختوں نے میری زندگی برباد کر دی۔ لپک کر آئی۔ دونوں کو اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ مگر معصوموں کو کیا خبر تھی کیسی طرح چپ نہ ہوئے ایک گود میں ایک کندھے پر۔ انگیٹھی آ گئے۔ دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ کہ کہیں مزاج نہ بگڑ جائے اسی طرح آ کر دستر خوان بچھایا۔ روٹیاں رکھیں۔ سالن کی رکابی اتار رہی تھی۔ کہ اوپر سے دہکتا ہوا کوئلہ ہاتھ پر آ پڑا۔ پوچھا پھر نہ ہوا۔ رکابی چھوٹ گئی۔ اپنی تکلیف بھول سالن گرنے سے جان نکل گئی۔ کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میاں

دو لحہ تو خاموش رہا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"ان بے ایمانوں کے اُٹھنے کا بھی یہ ہی وقت تھا۔ ان کو پٹخ دو۔ اور سالن دیے جاؤ" دو تین لمحے اور گزرے۔ تو پھر کہنے لگا۔

"آخر کب تک بیگم صاحب کے رحم کا منتظر رہوں ؟ تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ کھانا دے دو۔ میری تو تمہارے ہاتھوں وہ مٹی پلید ہوئی ہے۔ کہ خدا دشمن کی بھی نہ کرے۔ اس سے تو میں کوارا ہی اچھا تھا۔ خدا کے واسطے تم میرا پیچھا چھوڑو۔ اور غارت ہو۔ لاؤ کہیں سالن دے چکو"۔

بیوی جواب کیا دیتی۔ خاموش تھی۔ اور سانپ کی طرح بھنبھناتا ہوا اُٹھا اور بگڑتا ہوا چلاتا چیختا ہوا آیا۔ اور تڑاتا ہوا سر پر آ کھڑا ہوا۔ ایک کبوتر تھا بلی کے منہ میں۔ ایک چڑیا تھی شکرے کے پنجہ میں۔ ایک گائے تھی قصائی کے ہاتھ میں۔ زبان خاموش تھی۔ مگر دل قصور کا معترف۔ اور ایمان غلطی کا مقر۔

شوہر نے یہ پھینک دیا۔ دکھائی نہیں دیتا تھا ؟ صبح کا کھائے ہوئے ہوں تمہارا کیا گیا۔ بھوکا مروں گا تو میں۔ فاقہ ہو گا تو مجھ پر۔ تم تو مزے سے ڈٹ چکیں" اتنا کہہ کر انگیٹھی ٹھکرا دی۔ دسترخوان الگ نائی میں اور سینی موری پر۔

جواب کیا تھا۔ اور کیا ہو سکتا تھا۔ سناٹا اور خاموشی۔ جب احسان بگڑتا بگڑاتا لیٹ رہا۔ تو دونوں بچوں کو لا کر لٹا دیا۔ بچے جب تک ماں کی گود میں رہے چپکے تھے۔ نیچے لٹانا تھا۔ کہ پھر لگے رونے مرے کو مارے شاہ مدار اور پریشان ہوئی۔ اِس کو چپکا کرتی ہے۔ تو وہ۔ اور اُس کو چمکارتی ہے تو یہ دونوں نے چلانا شروع کیا۔ چاہا کہ بچے اُٹھا کر باہر لے جاؤں مگر اب خرابی یہ پڑی کہ اُٹھاتی ہے تو ایک نہیں اُٹھتا۔ ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ اور بلک رہے ہیں۔ بہتیرے جتن کر ڈالے۔ مگر ننھوں کو بھوکے باوا پر رحم نہ آیا۔ بیچارے

بچھونا بغل میں مار باہر آپڑے۔ صبح ہی منہ بھر کی گھٹّی لی۔ اور بیوی کو لے گھر آ گئے؟

بیوی کے پہنچانے کا تو یہ فقط بہانہ تھا۔ مقصد اصلی نکاح ثانی خیال کا ظاہر ہونا تھا۔ کہ چاروں طرف شہرت ہوگئی۔ قدسیہ گیارہ بجے رات کو آئی تھی۔ زائرہ جاگ تو رہی تھی۔ اور ابھی کتاب رکھ کر لیٹی تھی۔ جی تو بہت چاہا۔ مگر اس وقت مناسب نہ سمجھا۔ رات تڑپ تڑپ کر کاٹی۔ دیوار بیچ گھر۔ بیچ میں کھڑکی صبح کی نماز پڑھتے ہی ماموں کے ہاں جا پہنچی + زائرہ کی آواز سنتے ہی قدسیہ باہر آئی۔ گلے ملی۔ خوش ہوئی۔ باتیں ہوئیں۔ یہ سب کچھ تو ہوا۔ مگر زائرہ دیکھتی ہے کہ سہیلی کی صورت پر اوس پڑ گئی۔ اور پھول سا چہرہ کملا گیا۔ کپڑے اچھے ہیں۔ زیور بھی ہے۔ مگر بے فکری کی اس رونق کا جس نے دل کا کنول کھلا رکھا تھا۔ کوسوں پتہ نہیں + جب ذرا ماموں ممانی ادھر ادھر ہوئے۔ تو پوچھا قدسیہ یہ کیا مصیبت آئی۔ خدا کے واسطے کہہ تو سہی کیا گزر رہی ہے؟ زائرہ کا سوال اس پھوڑے پر جو مدتوں سے پک رہا تھا۔ ایک نشتر تھا۔ جس نے بے قابو کر دیا۔ رو دی۔ اور کہا "زائرہ کیا پوچھتی ہے۔ جو مجھ پر پڑی۔ خدا دشمن پر نہ ڈالے"

اس کے بعد قدسیہ نے اپنی رام کہانی سنائی۔ تعجب کے مارے۔ اور غصّے کی وجہ سے زائرہ کا ایک رنگ آ رہا تھا۔ اور ایک جا رہا تھا۔ خود بھی رونے لگی + جب یہ سنا کہ دو برس کے بعد احسان آئے۔ ساس سسرے نہ سہی۔ حقیقی چچا اور سگی چچی سے جن کے پاؤں میں نکاح سے پہلے ٹوپیاں ڈالیں ایک دو ہی سال میں ایسے فرنٹ ہوئے۔ کہ سلام تک نہ کیا۔ گھر میں گھسے تک نہیں۔ بیوی کو ڈیوڑھی میں چھوڑ گھر سیدھے ہو لئے۔ تو آگ لگ گئی۔ غصّے میں کانپتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر آئی تو سنتی کیا ہے۔ کہ احسان دوسرے

نکاح کی فکر میں ہیں ؛
زائرہ کا اگر بس چلتا۔ تو وہ اس موقع پر احسان کو کچا کھا جاتی۔ اور ایسے کمبخت مردوں کا وجود دُنیا سے غارت کر دیتی۔ مگر اوّل تو کنواری۔ اس پر عمر میں سب سے چھوٹی ہونے پر سہاگہ یہ کہ۔ آپس کی رشتہ داری۔ ایک ماموں کا بیٹا احسان ایک کی بیٹی قدسیہ۔ دوسرے بولیں تو کس کی طرف۔ اور ایمان کی بول کر بُرے بنیں تو کیوں؟ دونوں آنکھیں برابر۔ دونوں رشتے یکساں۔ بزرگوں کا یہ رنگ دیکھ کر زائرہ اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی۔ کہ چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور رو گئے۔ دل ہی دل میں گھل کر اور اندر ہی اندر جھلس کر چپ ہو رہی + مسلمانوں کو بیبیوں کی کیا کمی؟ احسان کے منہ سے نکالنے کی دیر تھی۔ بیبیوں جگہ ہاں ہو گئی۔ اور ایک پندرہ ہی دن میں میاں احسان نئی دُلہن کے دُلہا بن گئے + شادی ہوئی دُلہن آ گئی۔ احسان باغ باغ تھے خوشی کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اور چاروں طرف بیوی کی تعریف کرتے پھرتے تھے۔ باقی کے پندرہ دن بھی اسی طرح بسر ہوئے + جانے سے ایک روز قبل کا ذکر ہے۔ کہ قدسیہ جو رات دن اپنی بدنصیبی۔ بچوں کی تقدیر اور احسان کی بے وفائی پر روتی رہتی تھی۔ بیمار ہوئی۔ بیماری درحقیقت میاں کے دوسرے نکاح کی تھی۔ جس کا گھر اس طرح برباد ہو جس کا شوہر یوں چھین جائے۔ جس پر یہ کچھ بپتا آ پڑے۔ اسی کے دل سے پوچھنا چاہئے کہ کیا گزر رہی ہو گی + بخار معمولی تھا۔ مگر ایسی حالت میں آیندہ زندگی کا خیال آیا۔ زائرہ پاس بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور کہنے لگی "زائرہ پیاری دل زخمی اور کلیجہ ناسور ہے۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب۔ مجھ سے بڑھ کر بد قسمت کون ہو گا۔ زندگی برباد اور عمر اکارت گئی جس شخص سے عمر بھر کی

اُمیدیں تھیں۔ جو مصیبت کا ساجھی اور خوشی کا شریک تھا۔ جس نے مجبّت کے اور نباہ کا اقرار کیا تھا۔ آج وہ جان کا دشمن اور خون کا پیاسا ہے + گھر تباہ برباد۔ اُمیدیں غارت۔ اور ارمان خاک میں رل گئے۔ اب مصیبت بھری زندگی ہے اور میں ہوں۔ میرے پھول سے بچّے۔ میری آنکھ کے تارے میرے ساتھ ذلیل و خوار ہو گئے۔ ابّا جان خود پریشان ہیں۔ پریشانی میں پریشانی یہ بڑھی۔ کہ میرا خرچ اور آپڑا۔ روٹی مجھ کو کھا رہی ہے۔ میں روٹی نہیں کھا رہی۔ پرسوں کھڑے کھڑے آئے تھے۔ میں اپنی عادت کے موافق پیچھے جاکر کہیںا جھلنے لگی + کہا "ذرا اپنا زیور دے دو"۔ بھلا تُو ہی مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ ان کا مال تھا۔ میں منع کرنے والی کون۔ فوراً تعمیل کی۔ اور صندوقچہ کھول زیور لا کر دے دیا۔ لے کر چلے گئے۔ کل چھوٹی چچی جان کی زبانی سُنا۔ کہ سارا گہنا وہ بیوی پہن رہی ہے ہیں۔ نئے سہاروں میں بمبئی سے موتی منگوا کر اپنے ہاتھ سے ڈالے تھے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ وہ میری تقدیر کے نہیں ہیں۔ بخار کیا یہ صدمہ ہے جس نے بیمار بنا دیا"+ زائرہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی"۔ ہاں بہن سچ کہتی ہے"۔ مگر دل میں ٹھان لی۔ کہ جان رہے یا جائے۔ دُنیا اچھّا کہے یا بُرا۔ اور لوگ نکّو بنائیں یا نام رکھّیں۔ مگر ایک دفعہ دم میں دم اور جان میں جان ہے تو بھائی احسان سے دو دو باتیں کروں گی + وہاں سے اُٹھ گھر آئی تو باپ نے پہلے یہی پُوچھا۔ کہ "کہو بیٹی زائرہ تم نے اپنے بھائی احسان کی نئی دُلہن کو بھی دیکھا۔ اُن کے ہاں آج گیارھویں شریف ہے۔ سب جمع ہوئے ہیں تمہارا بھی بلاوا ہے۔ جاؤ ہو آؤ + اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مُنہ مانگی مراد مل گئی۔ جھٹ کپڑے بدل۔ مُنہ ہاتھ دھو۔ ڈولی منگوا جا پہنچی + احسان زائرہ کی صُورت دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اوّل تو بہن۔ اس پر مقول ان دونو پر طرّہ قدسیہ

کی سہیلی عزت سے اُتروایا۔ تعظیم سے بٹھایا۔ باجے بج رہے تھے۔ ڈومنیاں گا رہی تھیں۔ شام تک خوب ہا ہا ہو ہو ہوتی رہی۔ زائرہ بہ ظاہر ان کھیلوں سے خوش۔ ان خوشیوں میں شریک۔ اور اس تفریح میں شامل تھی۔ مگر دل پر جو کچھ گزر رہی تھی۔ وہ وہی خوب جان سکتی تھی۔ بھائی کی دُلہن دیکھی۔ سہیلی کا زیور دیکھا۔ ہنستی رہی۔ بولتی رہی۔ ارادہ کرتی تھی کہ کچھ کہے۔ اور دل کی بھڑاس نکالے۔ مگر سب سے پہلے تو کوارپنے کی مُہر مُنہ پر تھی دوسرے شرم و حیا تیسرے بزرگوں کا آداب اور لحاظ۔ چوتھے صبر و تحمّل۔ یہ چار سبب تو ظاہر ہیں۔ اور نہ معلوم کتنے اَور ہوں گے۔ جنہوں نے زائرہ کی زبان خاموش اور لب بند رکھے تعجّب نہیں۔ زائرہ جس ارمان اور قصد سے آئی تھی وہ سب دل کا دل میں رہ جاتا۔ اور جن آنکھوں آئی ان ہی آنکھوں لوٹ جاتی۔ مگر کہتے ہیں۔ گیدڑ کی شامت آتی ہے۔ تو شہر کی طرف منہ کر کے بھاگتا ہے۔ زائرہ عصر کی نماز پڑھ کر اُٹھی تھی کہ احسان نے کہا۔ کہو بھئی زائرہ بیگم تم نے بھاوج کو بھی دیکھا؟

زائرہ۔ جی ہاں نہایت شوق سے؟

احسان۔ بُوا میں تو سمجھا تھا میری عمر ہی برباد ہوئی۔ مگر خدا نے پھر رحم کیا۔ اور اب میری زندگی سنور گئی۔ مجھ کو ایسی بیوی ملی ہے۔ جو میرے گھر کو جنّت اور مجھ کو انسان بنا دے گی؟

زائرہ۔ درست! خدا ایسا ہی کرے۔

احسان۔ تم ایسی چپ چپ کیوں جواب دے رہی ہو۔ کیا تم کو نئی بھاوج پسند نہ آئیں۔

زائرہ۔ میں پسند اور ناپسند کرنے والی کون۔ اصل پسند آپ کی ہے جب

آپ خوش ہیں تو سب خوش ہیں ؛

احسان۔ ہاں سچّی بات تو یہ ہی ہے۔ مگر تم جو کچھ کہہ رہی ہو رُک رُک کر کہہ رہی ہو۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ تم قدسیہ کی بہن بھی ہو اور سہیلی بھی۔

زائرہ۔ ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو ؛

احسان۔ تم نے ایمان کا فیصلہ نہ کیا۔ اگر غور سے دیکھو اور میرے دل کا حال پُوچھو۔ تو وہ کمبخت جو بیوی سمجھی جا سکتی اس کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس نے جیسی جیسی اذیتیں مجھے پہنچائی ہیں میرا ہی دل جانتا ہے۔

زائرہ۔ شاید آپ سچّے ہوں۔

احسان۔ تم کیسی دوغلی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری گفتگو سے بغاوت کی بساند آ رہی ہے۔

زائرہ۔ آپ کیوں ایسا خیال فرماتے ہیں میں نے تو کوئی بات ایسی نہیں کی۔ خدا آپ کو خوش وخرم رکھے۔ آپ کا گھر بھر گیا۔ میں نے پردیس کے حالات چونکہ قدسیہ کے نہیں دیکھے۔ اس لئے میں اس کے سوا کیا کہہ سکتی ہوں۔ کہ شاید آپ سچّے ہوں۔

احسان۔ تم کو اس بچّہ کا لانا میرے سامنے ہرگز مناسب نہ تھا میں جانتا ہوں۔ کہ یہ میرا بچّہ ہے۔ لیکن جب میں اس کی ماں سے قطع تعلق کر چکا تو مجھے اس سے کیا واسطہ ؟ تمہارا اس کو یہاں لانا سخت غلطی تھی۔

زائرہ۔ اگر یہ میری غلطی ہے تو معاف فرمائیے۔

احسان۔ میں تمہارے دل میں کھوٹ پاتا ہوں۔ اور تمہاری گفتگو میں خلوص نہیں دیکھتا۔ احسان کا اتنا کہنا تھا۔ کہ زائرہ کا چہرہ غصہ سے لال سُرخ ہو گیا۔ بگڑ گئی دوپٹہ سنبھال کر اوڑھا اور کہنے لگی:-

آپ نے ان بھولی بھالی عورتوں کو اپنی رائے سے متفق کر لیا۔ مگر آپ کی یہ خواہش کہ میں بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملاؤں یقیناً غلط ہے آپ کی محبت جھوٹی۔ آپ کا دعوے غلط۔ آپ کا خیال پانی کا بلبلہ۔ آپ کی رائے بھادوں کا چھینٹا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے ایک جیتی جاگتی۔ ایک زندہ روح قبر میں پہنچادی۔ آپ نے قدسیہ جیسی بچی کو۔ اس لڑکی کو جو اپنے کنبہ بھر کا مول ہے برباد کر دیا۔ آپ نے ان معصوم بچوں کو جو وہ اپنے گھر سے نہ لائی تھی۔ اس کی پالکی میں نہ تھے۔ محض اپنی نفس پروری اور خود غرضی پر قربان کر دیا۔ آپ کو کیا اس لئے کہ آپ مرد ہیں۔ اور ہر قسم کا حق حاصل ہے یہی زیبا تھا۔ کہ ایک بچی کو دھوکا دے کر جہنم واصل کر دیں؟ یہ بچہ جو اس وقت میری گود میں ہے۔ لاکھ نادان اور بے خبر سہی۔ مگر آپ کے مظالم اس کی معصوم آنکھیں۔ آپ کی بے اعتنائی اس کا ننھا سا دل فراموش نہیں کر سکتا۔ جس شخص نے قدسیہ جیسی بیوی کو جو راتوں اور دنوں ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔ گھر سے نکال باہر کیا۔ وہ اس بیچاری کی جو آج دلہن بنی بیٹھی ہے کیا خاک قدر کرے گا۔ اگر آج ہم میں آنکھوں کے اندھے اور ہیئے کے پورے نہ ہوتے۔ تو یہ بیٹی تم کو قیامت تک نہ ملتی۔ اور تم کو معلوم ہو جاتا۔ کہ بیوی پر ظلم کرنے کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا۔ کہ چار دن میں پھر نئے سرے سے دولہا بن گئے +

احسان۔ اوہو۔ تو زائرہ تم تو بھری بیٹھی ہو اگر بیٹی مجھے مل گئی۔ اور نکاح میں نے کیا۔ تو شرع اسلام کے موافق۔ مجھ پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

زائرہ۔ مگر وجہ نکاح؟

احسان۔ صرف یہ کہ بیوی خوش نہ رکھ سکی۔

زاہدہ۔ ناخوشی کا ثبوت۔

احسان۔ جہالت۔ پھوہڑپن۔ بچوں کی پرورش میں انہماک۔

زاہدہ۔ سبحان اللہ آپ بھی کیا معقول بات فرما رہے ہیں۔ جہالت کے اگر یہ معنے ہیں کہ وہ عالم فاضل نہیں تو مہربانی فرما کر میرے اور اپنے۔ اِن کے اور اُس کے خاندان میں کوئی لڑکی کوئی بیوی کوئی ماں کوئی عورت تو ایسی بتا دیجئے۔ جو قدسیہ سے زیادہ لکھی پڑھی ہو۔ جیسا ٹوٹا پھوٹا ہم سب لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ ویسی ہی وہ بھی ہے۔ رہا پھوہڑپن۔ یہ الزام جہالت سے بھی زیادہ لغو ہے۔ اُس نے کون سا فرض ادا کرنے میں کمی کی؟ کیا نہیں کیا؟ جھاڑو بہارو سلیقہ صفائی جو عورت کا ہنر اور گھر والی کے کام ہیں کئے۔ اور جتنے کرنے چاہئیں اس سے زیادہ کئے آپ کی اطاعت میں کون سی کسر کی؟ رات رات بھر کھانا لئے بیٹھی۔ دن دن بھر چولھے پر توا رکھا۔ ہاں یہ الزام سچا اور شکایت برحق کہ بچوں کی پرورش کرتی ہے مگر خود ہی غور کیجئے۔ کہ یہ الزام کہاں تک درست اور سچا ہے اور ایک شوہر کو اس لئے کہ بیوی بچوں والی ہو گئی۔ اس سے نفرت کہاں تک حق بجانب ہے۔ کیا ایسے ہی مردوں کو اور اسی وجہ سے اسلام نے چار نکاحوں کی اجازت دی ہے؟ افسوس ہے بھائی احسان میں اور زیادہ گفتگو نہیں کر سکتی۔ یہ بھی اس لئے کہ دل جلا ہوا تھا۔ زبان سے نکل گیا۔ مگر میں صرف اتنا کہتی ہوں۔ کہ یہ بچہ آپ سے اپنا حق مانگ رہا ہے۔ یہ آپ سے شفقت و محبت کا امیدوار ہے۔ اور اس لئے کہ حق دار ہے آپ اس کا حق ادا کیجئے۔

احسان۔ تمہاری گفتگو چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ تم کو یہ کہنا جو تم نے کہا۔ مناسب نہ تھا۔

زائرہ۔ ناگوار ہوا ہو تو معاف فرمائیے۔ میں نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ اور جانتی ہوں۔ کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ لیجئے میری ڈولی آ گئی۔ اجازت دیجئے کہ میں جاؤں۔

احسان۔ اچھا تم سے پھر کسی وقت گفتگو ہوگی۔

زائرہ۔ اور احسان کی گفتگو شروع ہوتے ہی سارے گھر کے کان ادھر لگ گئے تھے۔ زائرہ کی تقریر سے گھر بھر میں سناٹا چھا گیا۔ عورتیں اور لڑکیاں جتنے مہمان گھر میں بھرے تھے۔ سب منہ تکنے لگے۔ اس کی قابلیت اور علمیت کا شہرہ تو پہلے ہی شہر بھر میں ہو چکا تھا۔ آج کے معرکہ نے اور بھی سکّہ بٹھا دیا۔ وہ تو چلی گئی۔ مگر بیویاں جب تک موجود رہیں۔ اس کی تعریف میں سرگرم اور گئیں تو اسی کا ذکر کرتی اور دعائیں دیتی۔

(۴)

دور کے ڈھول سہاونے نہیں۔ زائرہ کا کوارپتہ ہاتھ کنگن کی آرسی تھا یہ چاند کوارپتہ کے گہن میں ضرور تھا۔ مگر اس کی چمک شہر بھر کو منوّر کر چکی تھی۔ ایسی بیٹی کو بَر دن کی کیا کمی۔ غریب اس کے متمنی۔ امیر اس کے گرویدہ کنبہ اس کا شیدائی۔ اور غیر اس کے مدّاح۔ بیچ والوں کی جوتیاں ٹوٹیں نہ بَر تقعے والیوں کے بَرقعے پھٹے۔ ایک کی گنتی تھی نہ دو کی۔ درخواستوں پر درخواستیں اور پیغاموں پر پیغام ٹوٹ رہے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ افضل کے واسطے یہ سخت مشکل کا وقت اور دقّت کا سامنا تھا۔ اگر کہیں اس موقع پر افضل کے ہوش حواس درست اور عقل ٹھکانے رہتی تو جس طرح زائرہ کنبہ بھر کا مول تھی۔ شہر بھر کا نگینہ ہوتی۔ مگر مصیبت یہ آئی۔ کہ دولت کے پردے باپ کی آنکھوں پر پڑ گئے۔ پیغام نکھے سے نکھے آیا ایک بھی نہ آیا۔ بے عیب

ذات خدا کی۔ مگر ہاں مقابلہ دولت اور علم کا تھا۔ توصیف تھا تو غریب۔ مگر
ایسا غریب نہیں کہ دانت کریدنے کو تنکا تک نہ ہو۔ باپ پچاس روپے کا
نوکر۔ چودہ پندرہ کا کرایہ۔ آٹھ دس کی آمدنی ماں کے حصہ کی۔ غرض ستر اسی
کی لپیٹ سمجھ لو۔ گھر ہیں ماما۔ ڈیوڑھی پر نوکر اوسط گذران کا خاصا خاندان
تھا۔ مگر ہاں زیور جائداد گھوڑا گاڑی اللے تللے نہ تھے اور یہ بھی لڑکے کی
ماں نے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ چٹنی روٹی موجود ہے۔ لڑکا ابی اسے میں پڑھ رہا
ہے۔ اگر لڑکی کے نصیب کا ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ نہیں تو بھرے گھر
میں جائے اور آٹ ہو جائے + افضل نے انکار تو نہ کیا اور اس میں بھی شک
نہیں کہ اگر تنصیر کی ماں سال بھر اور خاموش رہ جائے تو زائرہ توصیف کے
نکاح میں آئے اور ضرور آئے۔ مگر تنصیر کی ماں خدیجہ نے کمال یہ کیا۔ کہ نند
کا نندوئی گلے لاگ لگ رہی۔ دور پرے کا رشتہ ڈھونڈھ ڈھانڈھ۔
زائرہ کی ماں سعیدہ کو ڈھنگ پر لے ہی آئی۔ کنبہ۔ دولت خوشامدیں دباؤ تھے
جو افضل پر ایک ساتھ پڑے۔ اس سودے پر رُوکن سمدھن کی لپیٹے دار تقریر
اور بیوی کی ہاں میں ہاں۔ غرض نیم راضی ہو ہی گیا۔ موقعہ ٹیڑھا تھا اور
وقت نازک۔ بات جھگڑے کی تھی اور معاملہ پیچیدہ۔ افضل سُن چکا تھا اور سنتا
گیا۔ دیکھ چکا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ لڑکا کا تو لڑکا۔ لڑکے کے باپ بھی الف
کے نام بے تک نہیں جانتے۔ ماں لاکھ اس وقت ملتجی اور خواستگار ہے لیکن
تمکنت اس کی صورت سے۔ غرور اس کی حالت سے دولت اس کے ہاتھ
سے اور محبت اس کی بات بات سے ٹپک رہی ہے بس گھر کے کواڑ تک بیٹی
کو دے دوں۔ زائرہ پتلی کی طرح ایک ٹانگ سے پھرے۔ مگر اس کے بھاؤ تو یہ
نہ ہوگا + دور نہ جاتا خود خدیجہ کی شادی افضل کی آنکھ کے روبرو تھی ظہیرالدین

داروغہ کہنے کو تو سپاہی تھا۔ مگر ضلع داروں کا مقابلہ ایسا کیا۔ کہ دُنیا واہ واہ
کرنے لگی۔ بیٹی کو بھینس دی۔ داماد کو گھوڑا دیا۔ کام کو غلام دیا۔ خدمت کو
لونڈی دی۔ گاؤں دیا۔ جائداد دی۔ سب کچھ دیا۔ اور بہت کچھ کیا۔ کہنے کو
ساٹھ روپے کا اہل کار تھا۔ مگر پندرہ ہزار روپے کا جہیز لے کر خدیجہ اس
طرح گھر سے نکلی۔ کہ سارا بازار دنگ رہ گیا۔ لیکن مرغی جان سے گئی۔ کھانے
والوں کو مزہ تک نہ آیا وہاں کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ تانبے کی قلعی دار
برتن۔ چاندی کی طرح جھمک مارتے رہے۔ اور پروا نہ ہوئی۔ الماریاں میزیں
کُرسیاں دیکھنے دکھانے کے لائق چیزیں انگنائی میں رُلتی پھریں۔ اور کسی
نے آنکھ بھر کر نہ دیکھا + رتی رتی بات نہ سہی مگر خدیجہ کے حالات چھپے ڈھکے
نہ تھے۔ دُلہن سے ماں اور ماں سے نانی۔ بن گئی۔ مگر یہ ارمان پُورا نہ ہوا۔ کہ
ایک دفعہ ساڑی باندھ لوں عجیب تھا۔ قدیم نہ جدید وہ ہوتا کہاں سے۔ تعلیم
تھی نہ تہذیب۔ ہاں دولت کے انبار اور روپے کے ڈھیر ضرور تھے + تقدیر
کا پھیر اور وقت کی بات تھی۔ کہ افضل نے جبنتی مکھی کو ترنوالہ سمجھا اور دولت
کے بھاڑ میں بیٹی جھونک دی + ہم کو اس سے اتفاق ہے۔ کہ افضل زاہدہ
کی شادی کا مختار اور اس انتخاب کا مجاز تھا۔ لیکن اس انتخاب کے اگر یہی
معنے ہیں۔ جو افضل نے سمجھے تو خدا دشمن کو بھی ایسے اختیار سے محفوظ رکھے +
بیٹی کے جوان ہو جانے پر افضل کے پاس جو پیغام پہنچے۔ اُن میں صرف
وہ ایسے لڑکے چھانٹ لیتا۔ جن میں ذاتی جوہر موجود تھے یا موجود ہونے
کی توقع کی جاسکتی تھی + اپنی حیثیت دیکھتا ان کی حالت بڑوں کی مثل ہے
تو پرانی مگر بادن تولہ اور پاؤ رتی کی۔ کہ "امیر کی بیٹی لے آئے دے نہیں"
موٹی سی بات تھی۔ پس جاتا۔ مرجاتا۔ تباہ ہوتا۔ برباد ہوتا۔ ذلیل ہوتا بفرض

ہونا۔ نگران کے بھانویں نہ تھا + ہونا اور ہوا۔ جو کیا وہ اکارت اور جو ہوا وہ ضائع
ضرورت یہ تھی اور کام یہ تھا۔ کہ لڑکے کی عادت۔ خصلت خو بو رنگ ڈھنگ
کا پتہ لگاتا اور دیکھتا کہ مزاج میں کچھ مناسبت بھی ہے یا نہیں۔ یہ تو نہیں کہ
بیوی اگلے زمانہ کی نمازن تہجد گزار جو باہر نکلنا گناہ اور تفریح کو جانا حرام سمجھتی
ہے۔ اور میاں آج کل کے صاحب بہادر جلسوں کی شرکت کو ثواب اور پردہ
کو عذاب خیال کریں اس اطمینان کے بعد بڑی بات یہ دیکھنی تھی۔ کہ بیٹی کسی
طرح شوہر سے ہیٹی نہ رہے۔ دولت میں عزت میں نجابت میں شرافت میں
بیوی کو میاں غنیمت اور میاں کو بیوی امرت ہو + یہ نہ ہو کہ میاں امیر اور بیوی
فقیر۔ مانا کہ افضل بھی تنخواہ دار تھا۔ مگر کہاں ڈیڑھ لاکھ کا تعلق دار اور کہاں پچاس
روپے کا پنشن خوار۔ اگر ایسی ہی ضرورت تھی۔ دل بھی چاہتا تھا۔ بری آ بنی
تھی۔ انکار کی گنجایش اور جواب کا موقع نہ تھا۔ تو یہ دیکھتا لوگ ہیں کس قماش
کے۔ دنیا کا میدان وسیع اور خدا کی مخلوق بھری پڑی ہے۔ عالم بھی۔ کورے
بھی بھاری بھرکم بھی چھچھورے بھی۔ یہاں کا نتیجہ ظاہر اور انجام روشن تھا +
وہ دقیانوسی خیال کے لوگ عدالت کے عاشق۔ مقدموں کے شیدا شگونوں
کے رسیا۔ فال گوشوں کے دھتیا + یہ طرز جدید کی دیوانی تعلیم کی دل دادہ۔
ہواخوری کی عادی۔ آزادی کی پابند۔ اس سے بڑھ کر تخالف اس سے زیادہ
ضد کیا ہوسکتی تھی؟ بہرحال ادھر بیوی کی صلاح اُدھر افضل کی مرضی۔ نکاح
ہوگیا۔ اور زاہرہ جیسی بچی کا ظالم باپ اور سنگ دل ماں کی بدولت دور
آزادی اس طرح ختم ہوکر وہ زمانہ شروع ہوا۔ جس پر اس کی دنیا کا دارومدار
اور زیست کا انحصار تھا + جمیل اور دالوں کی ٹکر۔ گڑیوں کا کھیل نہ تھی۔
گھر کا تنکا تنکا اور چھلا چھلا چھلا دیا۔ ادھر اُدھر سے قرض لیا اور لگایا۔ سال بھر کی

پنشن پیشگی لی۔ اور اٹھائی۔ اور خدا بھلا کرے گانٹھ کے پورے آنکھ کے
اندھے افضل کا کہ محض اس خوشی پر کہ بیٹی امیر کی بہو اور رئیس کی بیوی ہوتی
ہے۔ اپنا مال متاع اپنی بے فکری اور آزادی سب قربان کر بال بال مقروض اور
رگ رگ مقیّد ہو بیٹھا۔ اسلم حقیقی بھائی تھا تو بچّہ۔ مگر سمجھ رہا تھا۔ اور سمجھ چکا تھا۔
کہ باپ کی یہ خوشی دودھ کا اُبال اور نہاری کا وہ بگھار ہے جس کی تہ میں
وہ ہلاہل مرچیں ہیں۔ جو ایک باپ یا ماں ہی کو نہیں۔ سارے کنبے کو خون کے
آنسو رلوا دیں گی۔ مگر اس کی سمجھ کو دیکھتا کون اور سنتا کون عین برات کے
روز جب مردانہ اور زنانہ مردوں اور عورتوں سے پٹا پڑا تھا جمیل پور والیوں
نے چڑھاوا دیا تو پتہ چلا۔ کہ سچ مچ دُور کے ڈھول سہاونے تھے۔ تین
ساڑھے تین ہزار کا زیور میکے سے تھا۔ توقع تھی اور کچھ افضل اور سعیدہ ہی
کو نہیں۔ سارے کنبہ اور برادری کو کہ زائرہ کا چڑھاوا خدیجہ سے بڑھا
چڑھا ہو گا۔ مگر اونچی دوکان پھیکا پکوان مشکل سے چڑھاوا دو ہزار کا تھا۔
دیکھنے میں کافی۔ اور کہنے کو خاصا۔ مگر نہ اُن کی توقع کے موافق نہ ان کی
شان کے لائق سعیدہ اسی وقت بگڑ چلی تھی اور افضل بھی فرنٹ ہو گیا تھا۔
مگر اولاد نے مل جل کر پھر ماں باپ کو سمجھایا۔ اور سب سے زیادہ اسلم نے
کہ پہلی غلطی اس پیغام کی منظوری تھی۔ اور دوسری اب یہ اکھڑ پنچ سمدھنیں
اتر آئیں۔ برات آ بیٹھی۔ گھوڑا آ گیا۔ پینس آن پہنچی۔ یہ خیال تھا تو چڑھاوا
پہلے طے کیا ہوتا۔ نہ کیا تو اب بگڑنا فضول اور روٹھنا بیکار۔ برات اُٹھ
گئی تو شہر بھر میں ناک کٹ جائے گی۔ مردوں کی زبان سچی اور شریفوں کی
بات ایک ہوتی ہے۔ یہ وقت بگڑنے اور موقع اکڑنے کا نہیں ہے۔ جو
بندھ گیا وہ موتی۔ جو رہ گیا وہ کنکر۔ صبر کیجئے اور بسم اللہ شکر کیجئے اور دعا۔

کہ خدا انجام بخیر اور نتیجہ اچھا کرے + اسلم کی گفتگو سمجھ میں آ گئی۔ اور نکاح ہو گیا۔ خدیجہ رشتے میں زائرہ کی خالہ مگر درحقیقت آفت کی پرکالہ تھی۔ نکاح سے پہلے تو اس طرح ہنستی رہی۔ کہ ہونٹوں پر گوند۔ سن رہی تھی۔ اور سمجھ رہی تھی۔ کہ چڑھاوے پر ناک بھوں چڑھ رہی ہے۔ مُنہ سے اُف نہ کی مگر شہدوں کی آواز دولہا ست پُوتا جو نکاح کا اعلان تھا۔ کان میں آئی تھی کہ بپھر گئی۔ اور صاف کہہ دیا۔ اُن کا تو آخری کام ہے جو کچھ نہ کریں تھوڑا۔ مجھے تو پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں بنجنی ہیں۔ اگر اس طرح آنکھیں بند کر اندھا دُھند چڑھاوے پر کمر باندھوں گی تو چار ہی دن میں گھر کا گھر وا کر بیٹھوں گی۔ افضل نے بھی سُنا۔ سعیدہ نے بھی۔ بہنوں نے بھی اور بھائیوں نے بھی۔ مگر سانپ نکل اور تیر چھوٹ چکا تھا۔ بولتے کیا اور کہتے کس سے ؟ سب دم بخود رہ گئے۔ اور زائرہ میکے سے وداع ہو کر سسرال جا پہنچی ٭

(۵)

غلطی کا ارتکاب جانور سے نہیں انسان ہی سے ہوتا ہے۔ مگر یہ غضب نہیں ہوتا۔ کہ معاملہ کی ابتداء انتہاء آغاز انجام۔ جس پہلو پر نظر ڈالو۔ غلط اور جس مسئلے پر غور کرو غلط۔ یُوں تو یہ انتخاب از سر تا پا غلط تھا ہی۔ مگر جن غلطیوں پر بدنصیب باپ نے مطلق توجہ نہ کی۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ افضل اچھی طرح سوچ لیتا۔ کہ بیٹی میاں کی بیوی ہی نہیں۔ ساس کی بہو اور نندوں کی بھاوج بھی بن رہی ہے۔ اور ہندوستان کا تمدن ان تعلقات کا فیصلہ ساس کلیجہ کی پھانس اور نند بجلی کی بسنت جیسے الفاظ میں کر چکا ہے + یہ بحث ہمارے مضمون سے باہر ہے۔ اس لئے ہم نظر انداز

کرتے ہیں مگر افضل کا فرض تھا۔ کہ وہ سمجھ لیتا۔ کہ زائرہ باوجود نکاح کے پہلے خدیجہ کی بہو اور اُس کے بعد تنصیر کی بیوی ہو گی۔ ساس کی زندگی تک اس کی حیثیت ایک معزز قیدی اور گرفتار مجرم سے زیادہ نہیں + زائرہ کو زیور سے نفرت تو نہیں مگر کچھ ایسی زیادہ رغبت کبھی نہ تھی۔ صحبت ملی اُن بیویوں کی جو کلب کی شیدا۔ سیر کی عاشق۔ رنگین لباس سے متنفر۔ زیور سے بیزار۔ پالا پڑا۔ اُن لوگوں سے کہ جن کی دُنیا گھر اور زندگی گھر کا صحن۔ زیور کے غلام اور رنگین کپڑوں کے دلدادہ۔ تاہم عورت تھی سمجھ دار۔ معاملے کو سمجھنے اور بات کو پرکھنے والی جانتی تھی۔ کہ زنجیر نکاح پھولوں کا گہنا نہیں کہ پہنا اور اُتار پھینکا۔ یہاں رہنا اور سہنا مرنا اور بھرنا ہے۔ زندگی ان ہی لوگوں کی خوشی سے اور اطمینان اُن ہی کی رضامندی سے بسر ہو گا +

تقدیر کی بات تھی دوسرا چالہ سگی خالہ کے ہاں تھا چاہا۔ کہ صرف اکہرا اکہرا زیور پہن چلی جاؤں۔ مگر جمیل پور والوں کی ناک محض زیور کے ساتھ وابستہ تھی + خدیجہ خاصی ادھیڑ ایک چھوڑ آٹھ دس بچّوں کی ماں۔ نواسوں کی نانی۔ دامادوں کی ساس۔ مہینہ کی مہندی اور آٹھویں دن کا خضاب ناغہ نہ کرتی تھی + زیور اس کی جان۔ گوٹہ کٹھپّہ اس کا ایمان۔ حد یہ ہے کہ بیمار پڑی۔ بخار چڑھا۔ ذات الجنب ہوا۔ حکیم نے نبض دیکھی۔ تو کہنیوں تک ہاتھ سونے میں لوٹ رہے تھے + زائرہ کی مجال کیا تھی کہ ہوتے سوتے دو دن کی دُلہن اور سر سے پاؤں تک گہنا پہن کر نہ جاتی۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اس نے اپنا خیال دل میں رکھا اور ظاہر نہ کیا + ارادہ ہی کیا تھا۔ کہ ساس نے کہا۔ بیٹی ڈولی آگئی زیور سارا پہن لو۔ جوڑا بنارسی پہننا چالا ہو گیا بات گئی گزری ہوئی۔ صبح کو زائرہ ساس کے سلام کو آئی۔ یہ کہہ بھی

ایسی لگی تھی۔ جس نے غریب بچی کو ناک چنے چبوا دیئے۔ حکم یہ تھا کہ ساس کے اُٹھنے سے پہلے بہو سلام کو حاضر ہو جائے۔ اور لطف یہ تھا کہ ساس سانس کی مریض۔ آئے دن کی روگن اور بارہ مہینہ کی بیمار۔ نماز تو نہ کبھی خود پڑھی نہ کسی بچے کو پڑھوائی۔ مگر نماز سے پہلے اُٹھ بیٹھتی تھی۔ مُنہ ہاتھ دھویا کنگھی چوٹی کی اور بن ٹھن پٹاری کھول غالیچہ پر بیٹھ گئی۔ اب بہو بیمار ہو یا تندرست۔ جی چاہے یا نہ چاہے اور موقع ہو یا نہ ہو۔ مگر سلام کو حاضر ہو۔ خیر زاہرہ سلام کو آئی بیٹھی۔ ایک آدھ بات کا جواب دیا۔ آفتاب نکل آیا تھا۔ کہ خدیجہ کی نظر بہو کے ہاتھ پر پڑی۔ دیکھتی ہے تو گجراتی کنگن ندارد۔ کس کا صبر اور کہاں کا تحمل۔ کیسی مروت اور کدھر کا لحاظ۔ یسٹ پٹا گئی اور کہا کنگن کہاں ہے؟ زاہرہ دیکھتی ہے تو واقعی نہیں۔ کمرے میں آئی۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے ساس۔ بچھونا دیکھا۔ صندوقچہ دیکھا۔ کپڑے جھاڑے ادھر دیکھا۔ اُدھر دیکھا۔ کنگن ہو تو ملے۔ ساس سر پر کھڑی تھی۔ اور جوں جوں دیر ہو رہی تھی اس کا غصہ تیز ہو رہا تھا۔ آخر کب تک صبر کرتیں اور خاموش رہتیں؟ کہنے لگیں :۔

"بیٹی اکیس روپے لائیں۔ سو روپے کا کنگن کھو آئیں۔ اچھا چالا ہوا سو روپے کا دھکا لگ گیا۔ بالی پتہ تو خیر سنا تھا کہ کو پنج کھل گئی نکل گیا مگر کنگن اور وہ بھی اینڈ دی کا کھلا کیونکر اور گرا کس طرح۔ کسی کو دے کر تو نہیں بھول گئیں؟

زاہرہ خاموش تھی۔ مگر ساس کا آخری فقرہ کلیجے پر برچھی کی طرح لگا۔ اور تیر کی طرح برسا۔ کنگن کا خیال تو بھول گئی مگر ساس کے اس احتمال نے کہ کسی کو دے کر تو نہیں بھول گئیں۔ بہت پریشان کیا۔ ناشتا آیا۔ تو

تنصیر دہ ایک دفعہ کہہ سُن خود کھا بی۔ چلتا ہُوا سمجھی یہ تھی۔ کہ خاموشی کی وجہ ناشتہ سے انکار۔ افسردگی کا سبب تنصیر پوچھے گا۔ اور پوچھنا چاہئے تھا۔ یہ سوال کہ وہ کیا کہتی اور کیا بتاتی علیحدہ ہے + بہرحال زائرہ کا حصّہ واپس اور کچوریاں جوں کی توں چلی گئیں۔ خدیجہ نے دیکھا۔ جانتی تھی۔ کہ کنگن کے رنج میں کھانا نہ کھایا۔ مگر کہتی کیا ہے۔

"بیوی چوری اور سرزوری اتنا بڑا نقصان کر بیٹھیں اور پھر ناشتا بھی نہ کیا"+

یہ مرے پر سو دُرّے اور زخم پر نمک تھا۔ اور ہمارا خیال تو یہی ہے کہ زائرہ جیسی طبیعت کی عورت کے واسطے جس نے چودہ پندرہ برس کو ارپنے کے اور اگر ہوش سنبھالنے کے بعد سے لگائیں تو بھی آٹھ دس سال میکے میں اس طرح گزارے کہ ماں کی یا باپ کی اور بہن کی یا بھائی کی کبھی آدھی بات تک نہ سُنی + ساس کا چرچا زہرآلودہ تھا۔ کانپ اُٹھی۔ چکرا گئی مگر مردہ بدست زندہ۔ وہ شوق شان اور ناز برداری میکے ہی کی چوکھٹ تک تھی۔ یہ سسرال کا دروازہ تھا۔ جہاں عزیز اور رشتہ دار تو درکنار ماماؤں تک نے دن بھر یہی کہہ کر جان کھالی "بیوی کنگن ملا" پڑتی پر پڑتی یہ اور پڑی کہ شام کا چالا پھر تھا۔ میاں کے گھر پر ساس کی آنکھ کے سامنے چپکی بیٹھتی اور بھوکی رہتی تو دیکھنے والے دیکھتے اور سمجھنے والے سمجھتے۔ محبت نہ سہی۔ مُروّت سے اور کرم سے نہ سہی رحم ہی کھا کر ساس۔ نند۔ میاں نندوئی کوئی تو دلجوئی کرتا۔ بھوکی گئی اور بھوکی آئی۔ رنجیدہ پہنچی اور افسردہ لوٹی۔ چار پہر کا دن اور ساڑھے چار پہر کی رات صاف آنکھوں میں نکل گئی مگر دانہ تک مُنہ میں اُڑ کر نہ گیا۔ ساس کو غرض اور شوہر کو ضرورت کیا۔ کہ کچھ

پوچھنے؟ صبح شام اور رات فجر ہوگئی۔ گرمی کے دن تھے خالی پیٹ اور نہار
منہ پانی پیتی رہی۔ حرارت ہوئی۔ سر میں درد ہوا۔ رات تکلیف میں گزری اور
بیماری میں کاٹی۔ یہ وہی زائرہ تھی جس کے ادنےٰ سے زکام پر باپ بے
چین اور ماں پریشان ہوجاتی تھی۔ آج کوئی جھوٹ موٹ بھی پوچھنے والا نہ تھا
اسی حال میں اُٹھی اور صبح ہوتے ہی ساس کے سلام کو گئی۔

ساس۔ بیٹی یہ سب زیور اب بڑھا دو۔ بس ایک ایک پتّا بالی رہنے
دو۔ تمہیں تو پہلے ہی زیور سے نفرت تھی۔

زائرہ نے ساس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپکی اُٹھ اپنے کمرہ میں چلی
آئی۔ ناشتہ آیا۔ آدمی اُن کا کیڑا ہے۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ کب تک
بھوکی رہتی۔ جی نہ چاہتا تھا۔ دل نے گوارا نہ کیا۔ مگر مجبور ایک آدھ کچوری
کھا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خدیجہ ان ساسوں میں ساس نہ تھی۔ کہ موقعہ پا کر کہتی
اور زبان پر لا کر خاموش ہوجاتی۔ اتنا دبی زبان سے آج بھی کہہ دیا۔ بہو بیگم
کی غیرت بس کل ہی تک کی تھی۔ ہاں بیوی نقصان جس کا ہونا تھا۔ ہوگیا
تمہارا کیا گیا اور چالے والی خالہ کا کیا بگڑا۔ ہم نے بھی عمر بھر گہنا پہنا۔ اور
آج اُنیس برس سے پہن رہے ہیں۔ یہ ساری سسرال بھری پڑی ہے۔
آج تک ایک چاندی کا چھلّا بھی گیا ہو۔ تو کوئی بتا وے۔

(۵)

احسان دوسرا نکاح کر پہلی بیوی اور دونوں بچے چھوڑ دوسری کو ساتھ
لے کر نوکری پر چلتے ہوئے۔ قدسیہ کی آنکھوں میں اب دُنیا اندھیرا اور زندگی
وبال تھی۔ عمر کاٹنی تھی۔ اور دُنیا گزارنی۔ شروع شروع کیفیت یہ رہی۔
کہ دن رات روتی اور ہر وقت سوچتی۔ اس کو اپنی زندگی کا خیال نہ تھا۔ رونا یہ

تھا۔ کہ میرے ساتھ معصوم بچّوں کی بھی مٹی پلید ہوئی۔ اُن کی زندگی برباد اور عمر اکارت گئی۔ لاکھ ابّا جان مُنہ پر نہ رکھیں۔ امّاں جان اُف نہ کریں۔ مگر بیاہی بیٹی دشمن کی بھی مَیکا نہ بسائے۔ پتھر اپنی جگہ بھاری اپنا۔ گھر اپنا ہی ہے۔ کس کس چیز کو روؤں۔ کس کس ضرورت کو پیٹوں۔ یہ بھی ان کی عنایت ہے کہ اتنا خیال رکھتے ہیں + جس پر حق تھا۔ زور تھا دعویٰ تھا۔ اس نے تو پلٹ کر دیکھا تک نہیں + کیسی منحوس گھڑی کی پیدائش اور پھوٹی تقدیر لے کر آئی تھی کہ دُنیا اور دین دونوں ہی غارت ہوگئے۔ ہر چند سوچتی اور بہتیرا غور کرتی۔ مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی۔ اتفاق سے یتیم خانہ کی مربّی کا انتقال ہُوا۔ لوگوں نے خورد بُرد شروع کی۔ حالت ہوئی خراب۔ انتظام میں آئی ابتری۔ دینے والوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور یتیم خانہ کے تمام کاروبار چوپٹ ہونے لگے + قدسیہ اس کام کی اہل تو ہمیشہ سے تھی۔ مگر اس موقعہ پر اوّل تو سب کی درخواست۔ دوسرے خوفِ خدا تیسرے خالی رہتے رہتے اس کا اپنا جی بھی اُکتا گیا تھا۔ کام کرنے لگی۔ اور چند ہی روز میں یتیم خانہ کہیں سے کہیں پُہنچ گیا +

زاہرہ کے نکاح کو ساتواں مہینہ تھا۔ کہ ایک روز صبح کے وقت جب بیٹھ دعائیں دعائیں پڑھ رہا تھا یہ خط اس کو ملا:۔

زاہرہ بیگم کو بدنصیب قدسیہ کا سلام

آج ایک شہر کے شہر میں تمہاری صورت کو دیکھے سات مہینہ کے قریب ہوگئے۔ بارہا دِل تڑپا اور جی چاہا۔ کہ جاؤں۔ کھڑے کھڑے دیکھ آؤں۔ مگر لُوا خدا نے اس قابل ہی نہ رکھا + شاباش تم کو میری پیاری کہ بچپن کے رشتے اور برسوں کی محبّت سب خاک میں ملا دی۔ اور کبھی صورت

تک نہ دکھائی۔ ہاں بیوی دُنیا کا یہی دستُور اور زمانہ کی یہی رفتار ہے تم سے کیا گلہ اور کسی سے کیا شکوہ۔ جس نے ہاتھ پکڑا تھا۔ اسی نے بات کی لاج نہ رکھی۔ اپنا غیر اور عزیز دشمن ہو گیا۔ جب احسان ہی جس کی جان کے ساتھ زندگی وابستہ تھی بھول گیا + تو تمہاری کیا شکایت + تم نے سُنا ہوگا کہ منجھلی بی کے بعد یتیم خانہ کا انتظام میرے سپرد ہو گیا۔ دُنیا تو ختم ہو ہی چکی تھی۔ میں نے بھی یہ سوچا۔ کہ شاید اسی بہانہ اُدھر کی بہتری ہو جائے + اب خُدا کا شکر ہے۔ دن اطمینان سے اور رات بے فکری سے بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کل رات کا واقعہ ہے کہ مجھ کو ایک زندہ باپ کی یتیم بچّی کی ایسی مصیبت کا حال معلوم ہُوا۔ کہ دل لرز اُٹھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہا تھا۔ اور مینہ کسی طرح نہ تھمتا تھا۔ بارہ بج چکے تھے جب میں نے سُنا کہ ایک مظلوم ٹوٹے ہوئے گھر میں اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اندھیر گھُپ میں دُنیا سے رخصت کر رہی ہے + دل نہ مانا طبیعت بے چین ہوئی۔ اور اسی حال میں روشنی لے کر پہنچی۔ دیکھتی کیا ہُوں۔ کہ ضمیرہ اپنی تین سال کی کمائی پچھلر۔ اسی بچّی کو گود میں لئے بیٹھی ہیں۔ بچّی بخار میں لوتھ ہے۔ سانس بگڑ چکا۔ حالت خراب ہو گئی۔ مُردنی کے آثار چھا گئے۔ مگر ممتا کی ماری کسی طرح دو چار لمحہ کی مہمان کو کلیجے سے جدا نہیں کرتی + یہ غضب کی سردی اور کڑکڑاتے جاڑے۔ مگر بدنصیب ماں ایک پھٹی ہوئی دری اُڑھائے بچّی کو لئے بیٹھی ہے۔ یہ بھی خُدا کی ایک مخلوق اور اس دُنیا کی وہ انسان تھی۔ جس کو زندہ رہنے کا حق تم سے تو نہیں مگر مجھ سے زیادہ حاصل تھا + پانی رُکنے کا اور ہوا ٹھہرنے کا نام نہ لیتی تھی مکان کچّا اور دیواریں بوسیدہ۔ جھڑی کیا ایک قیامت تھی۔ کہ دم فنا اور دل ہوا ہو

رہے تھے۔ مگر بدنصیب ماں کو کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ بچّی پر نگاہ اور لب پر دُعا۔ مجھ کو دیکھ کر مُسکرائی اور اتنا کہا "کیا تم بھی بیوی اسی دُنیا کی انسان ہو؟ اور پھر بچی میں مصروف ہوگئی۔ ماںتا کی اس سے زیادہ گرویدہ میں نے کبھی نہ دیکھی۔ بچّی کے پاؤں پر آنکھیں مل رہی تھی۔ گلے سے لگاتی تھی۔ اور روتی تھی۔ سنبھالتی تھی اور سینچتی تھی۔ بچّی بے ہوش تھی۔ اس نے ایک سسکی لی۔ اور دُکھیاری ماں چیخ مار کر کھڑی ہوئی۔ انگنائی میں آئی۔ آسمان کو دیکھا۔ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مینہ پڑ رہا تھا۔ للکاری اور کہا۔ میں وہ بدنصیب ہوں جو ایک رواج کا شکار ہوئی۔ اگر یہ بینا مجھ سے چھوٹتی ہے اور تیری مرضی یہی ہے۔ تو مجھ کو زندہ نہ رکھ"۔

ماںتا پھڑکی لوٹی۔ آئی۔ صورت دیکھی۔ نبض دیکھی۔ چہرہ دیکھا۔ سانس دیکھا۔ جھکی۔ پیار کیا۔ اور پھر کلیجہ سے لگا کر بیٹھ گئی + موت جو معمولی چیز اور زندگی کا لازمی انجام ہے۔ اس وقت عجیب رنگ دکھا رہی تھی + منعم کو اپنی نعمت کا۔ امیر کو اپنی دولت کا۔ بادشاہ کو اپنی سلطنت کا یہ ملال نہ ہوگا جو ایک لال کے خیال سے اس ماں کا ہو رہا تھا۔ موذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ کہ مہمان بچّی ماں کی گود خالی کر گئی + میں نے سنبھالا۔ سمجھایا۔ تسلی دی۔ اور پُوچھا کہ اپنی کیفیت اور مصیبت کا حال بیان کرو۔ تو بیتاب ہو کر اُٹھی اور بے ساختہ میرے گلے سے لپٹ کر کہنے لگی:-

"کیا پوچھتی ہو۔ کون ہوں۔ اور کیا بتاؤں کہ کیا ہوں۔ زندہ باپ کی مردہ بیٹی۔ اور امیر بھائی کی فقیر بہن۔ میری داستان درد انگیز اور میری بپتا مصیبت ناک ہے۔ کلیجہ دُہلا اور دل ہلا دے گی۔ میں وہ ہوں جو مسلمانوں کے مظالم کا شکار اور رواج کی بدولت ذلیل و خوار ہوئی

ہیں اس باپ کی بیٹی۔ اُس بھائی کی بہن اور اُس خاندان کی عورت ہوں جو مسلمان ہوکر اسلام سے بیزار اور خدا کے حکم سے منحرف ہوگئے۔ اور اس لئے کہ میں نے خدا اور اُس کے رسول کے حکم کی تعمیل کی۔ مجھ کو ذلیل کر دیا + میرا باپ اسی شہر میں۔ میرا بھائی اسی محلے میں موجود اور زندہ ہیں۔ دولت اُن کے پاس اور اقبال اُن کے ساتھ ہے۔ مگر میں اس لئے اور صرف اس لئے کہ ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوکر مسلمان لوگوں کے قبضہ میں بڑھی۔ رزق سے محروم۔ کپڑے کو محتاج۔ دُنیا کی ہر ضرورت کو ترس رہی ہوں + میری شادی کو تیسرا سال تھا۔ جب قدرت نے مجھ کو اس پھول کی ماں بنادیا۔ جو اس وقت تمہاری آنکھوں کے سامنے اس طرح مجھ سے جُدا ہوئی کہ میرے پاس ایک چمچہ شہد نہ تھا۔ کہ جان کندنی میں زبان تر کردیتی + میرا وہ دُور رہنے والا نہ تھا۔ وقت نے میرا ساتھ نہ دیا اور میرے سسرال والوں نے جو روشن خیال تعلیم یافتہ اور سچے مسلمان تھے۔ میری جوانی پر رحم کھایا۔ اور میرا نکاح ایک دوسرے شخص سے کردیا + یہ میری عمر کا سترھواں سال ہے۔ دنیا یقین کرے یا نہ کرے۔ مگر میں علی الاعلان اور ایمان سے کہتی ہوں۔ میری زبان نہ اُلٹتی تھی کہ میں ان کے اس احسان کے برخلاف کچھ کہوں + شرم دامن گیر اور حیا مُنہ کی زنجیر تھی۔ میں نہ سمجھ سکی۔ کہ یہ انقلاب میری زندگی تاراج اور دُنیا برباد کردے گا۔ بدقسمتی سے دوسرا شوہر بھی زندہ نہ رہا۔ اور سال ہی بھر کے اندر ہیضہ میں مُبتلا ہوکر مجھ سے جُدا ہوگیا + میری دوسری شادی کو پندرہ ہی دن گذرے ہوں گے کہ میکے کا میرے پاس یہ پیغام پہنچا:۔

"ہمارے خاندان میں آج تک بیوہ نے نکاح نہ کیا تھا۔ تو نے نکاح

نہیں کیا۔ بڑوں کی ناک جڑ سے کاٹ دی۔ باپ دادا کی عزت پر پانی پھیرا اور بھائیوں کی آبرو برباد کی۔ اور جو کام کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ تجھ کم بخت کے ہاتھوں ہو گیا + یہ کلنگ کا ٹیکا ہماری پیشانیوں سے جب تک ہم زندہ ہیں خاندان کے دامن سے۔ جب تک وہ موجود ہے۔ مردوں کی داڑھیوں اور عورتوں کی چوٹیوں سے جب تک وہ رہیں گی چھوٹ نہیں سکتا۔ تجھ کم بخت نے کورے اُسترے سے عورتوں کی چوٹیاں اور مردوں کی داڑھی مونڈ ڈالی۔ تو ناشدنی اسی دن کو پیدا ہوئی تھی کہ ایک تیرے طفیل خاندان بھر کی آبرو پر پانی پھر جائے۔ اگر ایسی ہی نکاح کی ضرورت ماری جاتی تھی۔ تو زہر کھا لیتی۔ مر جاتی اور دوسرا نکاح نہ کرتی + اب شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ جب تک زندہ ہے۔ اپنی صورت ہمیں نہ دکھا۔ اور ہم بھی کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہماری طرف سے تو اُس روز مر گئی۔ جس روز تو نے دوسرا نکاح کیا + ہم جانتے ہیں کہ بُرے کو موت نہیں۔ تو زندہ رہے گی۔ اور تیری بدولت جو بدنامی ہماری ہوئی اور ہو رہی ہے۔ یہ ختم نہ ہو گی۔ مگر تو مر جاتی۔ پیوند زمین ہو جاتی۔ ہم تیرے پھول کرتے۔ تو ہمارا دل خوش ہوتا۔ مگر تو زندہ ہے اور جیتی ہے اور اس شہر میں ہماری ناک کٹ رہی ہے +

میں اس پیغام کو سن کر دنگ رہ گئی۔ میری خواہش ہرگز نہ تھی کہ نکاح ہو۔ نہ میں سمجھ سکتی تھی۔ کہ یہ انجام ہو گا۔ اور کنبہ مجھ سے متنفر اور نام سے ایسا بیزار ہو جائے گا۔ کہ صورت تک دیکھنے کا روادار نہ ہو گا + میں اگر قصوروار ہوں۔ تو صرف اتنی کہ جس ساس کو میں نے کبھی تین سال میں جواب نہ دیا۔ جس خسر کے سامنے میں نے اس عرصے میں آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ جس وقت ان دونوں نے مجھ کو ڈولی میں سوار کر دیا۔ تو سوار ہو گئی + میں سمجھتی

تھی۔ کہ اصلی ماں باپ وہ ہیں اور شرعی ماں باپ ساس سُسرے۔ جس طرح اُن کی تجویز سے میں انکار نہ کر سکتی تھی۔ اور جس کے ہاتھ میں اُنہوں نے ہاتھ دے دیا۔ وہی مالک و مختار ہو گیا۔ اسی طرح ان کے حکم کی فرماں برداری میرا فرض ہے۔ اور جو کر رہے ہیں۔ مجھے اس میں انکار کا حق نہیں۔ تم مسلمان ہو اور ایمان رکھتی ہو۔ میری بات کا یقین کرنا مجھ کو ہرگز اُمید نہ تھی۔ کہ ماں باپ اس فعل سے ایسے بیزار ہوں گے۔ ورنہ میں قطعاً انکار کر دیتی۔ اور یہ وقت نہ آنے دیتی۔ جب دُوسرے شوہر نے بھی انتقال کیا۔ جس کی یادگار میرے پاس صرف یہ چھوٹا بچّہ ہے۔ جو اس وقت بے خبر پڑا سو رہا ہے۔ تو میرے پاس زندگی کا کوئی سہارا اور گزارے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں اس حالت میں اس خیال سے کہ بے قصور ہوں اور قدموں میں گر کر قصور معاف کروا لوں گی۔ ڈولی میں بیٹھ میکے پہنچی۔ میرے آنے کی اطلاع ہوتے ہی باپ اور بھائی غصّے میں کانپتے ہوئے باہر نکلے۔ میں وہ الفاظ جو اُنہوں نے مجھ سے کہے۔ زبان سے نکالنے نہیں چاہتی۔ میری ڈولی اسی وقت پھروا دی۔ اور اب میرا حال یہ ہے۔ کہ تین تین چار چار وقت کے فاقے مجھ پر گزر رہے ہیں۔ اور سردی کی حفاظت یہ گدڑیاں ہمارے جسم کی کرتی ہیں*

زائرہ بیگم۔ تم کو معلوم ہے۔ یہ بدنصیب ضمیرہ کون ہے۔ یہ تمہاری بچپن کی وہ سہیلی ہے جو چچا باوا سے پڑھنے آیا کرتی تھی۔ یہ بے گناہ ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان اس کی مصیبت پر آنسو گرائیں اس کی بچّی کا مُردہ بے گور و کفن پڑا ہے۔ اس لئے نہیں۔ کہ یہ تمہاری سہیلی ہے اور نہ اس لئے کہ یہ چچا باوا کی شاگرد ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ایک مسلمان

عورت آنکھوں کے سامنے اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہماری اعانت کی مستحق اور رحم کی محتاج ہے۔ اگر تم اس وقت اس بدنصیب کی کچھ مدد کر سکو تو نہ صرف اپنے فرض سے ادا ہوتی ہو۔ بلکہ اس ثواب کی مستحق ہو گی جس کا وعدہ مالک حقیقی اپنی کتاب میں کر رہا ہے"۔

زائرہ قدسیہ کا خط پڑھتے ہی بیتاب ہو گئی۔ آنکھ سے آنسو نکل پڑے خط شوہر کے آگے ڈال دیا۔ اور کہا دس روپے ماہوار جو اماں جان مجھ کو دیتی ہیں۔ میرے پاس موجود ہیں۔ اگر تم کہو تو اس میں سے پچیس روپئے بھیج دوں۔

نصیر نے خط اُلٹا سیدھا۔ دو چار سطریں پڑھیں مسکرایا اور کہا ایسی ایسی مصیبتیں لوگوں پر رات دن آتی رہتی ہیں۔ اگر تم دینا چاہتی ہو دے دو۔ میاں کی اجازت پاکر زائرہ نے اسی وقت پچیس روپے بھیج دیئے۔ آٹھ دس روپے میں بچّی کا گورگڑھا ہُوا۔ باقی میں ایک لحاف اور رضائی اور کچھ تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان ہو گیا۔

(۶)

اس واقعہ کے آٹھ یا دس روز بعد بزاز دروازے پر آیا خدیجہ نے کپڑا دیکھا۔ پسند کیا اور خریدا۔ روپے دیتے وقت اس کے پاس نوٹ تھے کہنے لگی "دولہن تم پچاس روپے دے دو۔ ابھی نوٹ بھنوا کر دے دیتی ہوں"۔

زائرہ کے پاس روپے کچھ کم تھے۔ ساس کا رعب اتنا تھا کہ ہر وقت ڈرتی رہتی تھی۔ کہ دیکھئے اس بات کا کیا انجام ہوتا ہے۔ خاموش ہوئی مگر پھر خیال آیا کہ میں نے صرف پچیس روپے اُٹھائے ہیں۔ باقی ایک پیسہ ادھر سے اُدھر نہیں کیا۔ وہ پچیس روپے میاں کی صلاح اور اجازت سے دیئے ہیں۔ روپے جو موجود تھے۔ لاکر دے دیئے۔ اور کہا "پچاس پورے تو نہیں

ہیں صرف اکتیس روپے موجود ہیں۔

ساس۔ تم نے روپے کہاں اُٹھا دیئے۔ بیٹی کپڑا کھانا یہاں ہے بڑا خرچ گھرداری اس سے الگ تھلگ ہو۔ ناشتے سے واسطہ نہ خانہ داری سے غرض۔ آخر روپے کہاں اُٹھائے۔ اور کیا لیا؟ اُٹھائے تو اچھا کیا میں منع نہیں کرتی۔ تمہارا مال تھا۔ مگر مجھے بھی تو دکھاؤ۔ میں بھی تو دیکھ کر خوش ہوں۔

زاہرہ۔ میں نے وہ روپے خدا کی راہ میں دیئے ہیں۔ اُٹھائے نہیں ہیں۔

خدیجہ۔ خدا کی راہ میں؟ ایک نہ دو اکٹھے پچیس! بیٹی۔ وہ اللہ کی راہ کا کون سا سودا تھا۔ جہاں پچیس روپے کھو بیٹھیں۔ بولو۔ جب دیئے ہیں تو بتانے میں کیا ہرج ہے؟

زاہرہ۔ یتیم خانے میں بھیجے تھے۔

خدیجہ۔ بھیجنے کا مضایقہ نہیں۔ مگر بیٹی ایسی آزادی کس کام کی صلاح نہ مشورہ۔ میں منع تو نہ کرتی۔ خدا کی راہ کا سودا ہے۔ جو دے اچھا ہے مگر یہ غضب کبھی نہ دیکھا۔ کہ پوچھ نہ گچھ۔ جو جی میں آیا کر بیٹھے۔

زاہرہ۔ میں نے اس کو ضروری نہ سمجھا۔ اس لئے نہ دریافت کیا آیندہ احتیاط کروں گی۔

خدیجہ۔ جب ضروری ہی نہیں ہے۔ تو پھر دریافت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ ہرگز بھی نہ پوچھنا۔ اپنی مرضی کی مختار۔ اپنی رائے کی مالک۔ جس کو چاہے دو۔ جس کا چاہے نام لو۔

زاہرہ۔ اور تو کوئی اماں جان ایسا نہیں ہے۔ جو میرے سلوک کا

منتظر ہو۔ اور میں اس کو دے کر خدا سے بھی جھوٹ بولواوں ؟

خدیجہ۔ ہو یا نہ ہو۔ مجھے کیا خبر۔ تمہاری چیز تھی۔ جس کو چاہے دی۔ خدا سے تم کیا ڈر رہی ہو۔ یہ جو کبھی کبھار دو ٹکریں مار لیتی ہو۔ اس سے اللہ والی بن گئیں ؟

زائرہ۔ اماں جان یہ آپ کے صاحب زادے بیٹھے سنس رہے ہیں۔ آپ ان سے دریافت فرمائیے۔ میں نے اُن کی اجازت سے دیئے ہیں ؟

تنصیر۔ میں نے کب اجازت دی تھی ؟ میں نے تو صاف کہہ دیا تھا۔ کہ ایسی ایسی مصیبتیں دنیا میں سینکڑوں آتی ہیں۔ کہاں تک اور کس کس کے ساتھ سلوک کریں ؟

خدیجہ۔ بیٹی یک نہ شد دو شد۔ منہ در منہ جھوٹ۔ اوّل تو تم کو میاں سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور جو پوچھا تھا۔ تو اس کی بات رکھی ہوتی۔ اُس نے منع کیا۔ اور پھر دے بیٹھیں۔ وہ ایسی مصیبت۔ میں بھی تو سنوں۔ کس پر آئی تھی۔ وہ جو اس دن گھر سے ماما آئی تھی۔ وہ اُس دکھڑے کو آئی تھی۔ کس پہ فاقہ تھا۔ جو تم نے تڑوا دیا ؟

اس کا جواب زائرہ نے کچھ نہ دیا۔ اور خاموش اپنے کمرے میں چلی آئی ؟

(۷)

خدیجہ کی بڑی لڑکی جو سال بھر سے سسرال گئی ہوئی تھی۔ اپنے دونو بچوں اور نوکروں چاکروں سمیت دو مہینے کے واسطے میکے آئی۔ جاڑے کا اختتام اور گرمی کا آغاز تھا۔ اور یہ وہ سال کہ چیچک نے شہر میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ اللہ اللہ نو نو برس کے بچّے ٹیکے لگے چیچکیں نکلیں چیچک کی

نذر ہوگئے + بھاڑ بُھن رہا تھا کہ ادھر بخار چڑھا۔ اور اُدھر بچّہ لوٹا تیسرے
دن دانہ دکھائی دیا۔ اور دو تین دن میں بچّہ چوپٹ۔ پھلرواسے لال آنکھوں
کے سامنے اور کھیلتے مالتے دیکھتے ہی دیکھتے گھر سونے کر گئے + بیماری شروع
ہوتے ہی خدیجہ کے ہاں چاروں طرف دالانوں میں۔ اور کوٹھڑیوں میں۔
دروازوں پر اور صحنچیوں پر چیچک کے تعویذ چپک گئے تھے۔ اور خیال یہ
تھا۔ کہ وبا اب یہاں اپنا مُنہ نہ دکھائے گی۔ مگر ایک دن دوپہر کے وقت
خدیجہ کے نواسے قمر کی انّا جو ہفتہ بھر سے بچّے کی چیچک میں مُبتلا تھی۔ گھر
میں آ گئی۔ اور کہنے لگی "لو بیوی اللہ کا شکر ہے۔ آج مر گئی۔ میں نے کہا۔
قمر پھڑک رہا ہوگا۔ آٹھ دن ہو گئے۔ جاؤں کھڑے کھڑے صورت دکھا
آؤں + اتنا کہہ کر انّا نے قمر کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور پیار کرنے لگی۔ زائرہ بھی
وہیں بیٹھی تھی۔ کہنے لگی "انّا تم بغیر نہائے دھوئے ان ہی کپڑوں سے
چلی آئیں۔ اور بچّے کو گود میں اُٹھا لیا +

انّا۔ اری بیوی ایسی مجھ میں کیا بیماری لپٹی ہوئی ہے جو گود میں لیتے
ہی لگ جائے گی۔ اللہ رکھے۔ ایک ہی گھر میں دو کو نکل رہی ہے۔ دو کھیلتے
پھر رہے ہیں۔ خدا کے معاملوں میں بندے کو کیا دخل ؟ کیا موت اور زندگی
بھی بندے کے ہاتھ میں ہیں ؟ اور جو بیوی ایسا ہی وہم ہے۔ تو لو۔ میں
چلی جاتی ہوں۔ نہ بیوی میکے میں آتیں۔ نہ مجھے ایسی باتیں سُننے پڑتیں +
جب تک اُن کا جی چاہے یہاں رہیں۔ وہاں جائیں گی۔ بُلوا لیں گی۔ میں
تو اللہ چاہے۔ اب یہاں آؤں گی نہیں + انّا تو یہ کہہ کر چلی گئی۔ اور قمر نے
انّا انّا کے نعرے مارنے شروع کئے + بہتیرا ہی گھر بھر نے بہلایا۔ ماں
نے چمکارا۔ نانی نے سنبھالا۔ مگر بچّہ دوپہر سے شام تک اسی طرح تڑپتا

اور پھڑ پھڑاتا رہا + زائرہ ایک بات کہ کر چپ ہو گئی - ادھر سے ساس اور اُدھر سے نند دونوں اس کی جان کو آ رہی تھیں اور وہ چپ بنی خاموش تھی ؎

نند - بھلا دلہن اس معصوم کو پھڑکا کر تمہارے ہاتھ کیا آیا ؟ دیکھ لو کیا آفت ڈھا رہا ہے ؎

ساس - بیٹی یہ تعلیم یافتہ ہیں - ان کی بلا سے چاہے کوئی مرے یا جیے مگر زبان نہ رکے ؎

زائرہ - میری نیت تو ہرگز یہ نہ تھی کہ اس بچے کو گزند پہنچے ؎

نند - تو ایسی بات کہنی کیا ضرور تھی جو دوسرے کو بُری لگے + ہماری تندرستی خدا کی طرف سے ہے یا کپڑوں سے اور نہانے سے ؎

ساس - بیٹی یہ تعلیم یافتہ ہیں - ان کا خدا فقط ان کی عقل ہے - اور آزادی کا یہ حال ہے - کہ یہ شرم حیا سب طاق ہیں - اب تو اللہ رکھے - اتنے دن ہو گئے - چالوں کی دُلہن تمہارے سامنے وہ پٹر پٹر بولی ہیں - کہ بچوں کے کان کترتی تھیں ؎

نند - خیر بی مجھے اس سے کیا - میرا بچہ کہیں بیمار نہ ہو جائے - پڑے گا تو سہی - کون وقتوں کا ہلکان ہو رہا ہے - اچھا ممانی نے سلوک کیا + زائرہ خاموش سدا کی تھی - ساس نندوں کی یہ فضیحتیاں کھڑی سُنتی رہی اور دل ہی دل میں اپنے اوپر لعنت ملامت بھیجنے لگی - کہ میں ہی بے غیرت تھی - کہ ایک بات بول کر نکّو بنی + میرا کیا بگڑ رہا تھا ؟ ماں تو ان کی تھی - بچہ اُن کا میں کون ؟ مگر میں نے تو بھلائی کی بات کی تھی - مجھے کیا خبر تھی - اس طرح بُری بن جاؤں گی ؎

کہیں رات کو تو پپ چلے - بچے کی زبان تالو سے لگی - تو بخار چڑھ چکا

تھا۔

ماں - لو بی اماں دیکھ لو بخار چڑھ آیا۔ کہو اب میں کیا کروں۔ اگر ایسی ویسی ہوئی۔ تو سسرال میں جا کر کیا منہ دکھاؤ گی؟

نانی - بیٹی میں کیا بتاؤں۔ میرا آپ ہی بخار کے نام سے کلیجہ نکل پڑا ان کا کیا بگڑا۔ مصیبت تو جس پر آئے گی اُسی پر آئے گی۔ نند غریب لینے میں نہ دینے میں۔ اچھی بھاوج سے ملنے آئی تھی۔ کہ بچہ ہی کو خدا بچائے۔

رات کا بڑا حصہ اسی غصہ فضیحتی میں گزرا۔ صبح کو بچہ بالکل بیہوش تھا۔ وہ دن اور رات بھی اسی طرح گزری۔ تیسرے دن دیکھتے ہیں تو موتیا پنڈے پر صاف جھلک رہی ہے۔

نند - بڑے بول کا سر نیچا ہے کہ ہم نے انا کو اس طرح کہا اس کا بدلا خدا نے ہم کو یہ دکھایا کہ لو اور بچے کی حفاظت کرو۔

ساس - بدلا ان کو ملتا۔ بڑا بول یہ بولی تھیں معصوم بچے نے کیا کیا تھا۔ اس کی وہی کہاوت ہے کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔

نند - کر تو ڈر۔ نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر۔ مگر خیر میں تو جو گزرے گی بھگت ہی لوں گی۔ مگر اسی کا نام تعلیم ہے۔ تو ایسی تعلیم سے تو جاہل اچھے۔

چیچک کھلا ہوا مرض متعدی تھا اور مناسب تھا۔ بلکہ مناسب بھی نہیں۔ ضرورت تھی۔ اور ضرورت بھی اشد کہ زائرہ فوراً چند روز کے واسطے میکے چلی جاتی۔ کچھ اس سلئے نہیں کہ وہ بچہ تھی۔ بلکہ اس سلئے کہ بچے والی تھی۔ اس کی گود میں بھی ایک لال تھا۔ اور اس کی مامتا نند سے کم نہ تھی مگر مجال کیا تھی۔ کہ اس طرف خیال بھی کر سکتی۔ ایک احتیاط نے تو بات کا بتنگڑ

اور کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اب کچھ بولتی۔ تو شاید گھر میں سے نکلنا پڑتا + دوسری مصیبت یہ تھی۔ کہ ساس کا سلام لازمی اور تیسری آفت یہ کہ اتنی ہستی نہ تھی۔ کہ بھانجے کی خیر صلاح ایک آدھ دفعہ دُور سے پوچھ لینا تو درکنار پاس آکر اور پاس بیٹھ کر ہل جُل کر اور رل مل کر گود میں نہ لیتی۔ اور پیار نہ کرتی + نتیجہ ظاہر تھا۔ جو ہونا چاہئیے۔ وہ ہُوا۔ زائرہ کے بچّے کو چیچک نکلی اور نکلی مگر کجا تین مہینے کی جان اور کہاں ڈھائی سال کا بچّہ سارا گھر اُدھر ہی لپٹا ہُوا تھا۔ اور زائرہ کے بچّے کو کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ خُدا کی مصلحت خدا ہی جانتا ہے۔ ظاہر تو جو کچھ بھی ہُوا۔ اچھّا ہی ہُوا۔ کہ قمر بچ گیا۔ اور زائرہ کی گود خالی ہوئی۞

(۸)

ساس کے رنگ یہ۔ نند کے ڈھنگ وہ۔ المختصر زائرہ کی حالت اب ایک ایسی مصیبت تھی جس میں اگر اُمید کی کوئی جھلک اور توقع کا کوئی ذرّہ نظر آتا تھا۔ تو وہ صرف تنصیر کی عنایت تھی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ چند روز بعد اُن اُمیدوں پر بھی پانی پھرا۔ اور یہ توقعات بھی خاک میں مل گئیں + یہ خیال کہ ساس کی مخالفت کا اثر شوہر پر پڑا غلط۔ تنصیر ماں کا فرماں بردار یا بہن کا عاشق زار کبھی بھی نہ تھا۔ نہ تھا نہ ہو سکتا تھا۔ امیر کا بچّہ ماں کا چہیتا باپ کا لاڈلا۔ تہذیب سے الگ۔ انسانیّت سے دُور چشم بد دُور نورٌ علیٰ نُور نہ تھا پڑھا نہیں۔ لکھا نہیں۔ صحبت نہیں۔ تربیت نہیں۔ فرائض سے بے خبر ہمدردی سے ناآشنا صرف اپنے نفس کا بندہ اور مطلب کا غلام تھا + بیوی کی داستانِ الم اس نے کبھی کان دے کر سُنی۔ نہ رُخ دے کر پوچھی + دن بھر تفریح تھی۔ تماشے تھے۔ سیر تھی شکار تھا۔ رات آدھی آدھی تاش اور گنجفہ

شطرنج اور چوسر میں گزر جاتی تھی + یار دوست رخصت ہوئے آیا اور پڑ رہا اب تک اُس کو بیوی سے نفرت تھی نہ محبت - ایک جانور تھا کہ اس کے نام کا ماں آئی - اور باپ نے پال لیا جلسوں سے فرصت اور جمگھٹوں سے فراغت ہی - اس کو بھی دیکھ لیا - ذائرہ نے اچھی اچھی کتابیں پڑھیں - بڑی بڑی نصیحتیں دیکھیں سمجھتی تھی کہ میاں کا رام کرنا کوئی ٹیڑھی کھیر نہیں - بیوی اگر دل پہ رکھتی تو عاجزی سے آدمی تو کیا - پتھر موم ہوتا ہے - سہیلیوں میں ہمجولیوں میں جب کوئی موقعہ آیا - اور ذکر چھیڑا - ہمیشہ ہنسی اور یہی کہا " مجھے تعجب ہے - کہ کس طرح شوہر فرنٹ ہو جاتے ہیں - بیوی کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ شوہر کو اپنے خیالات سے متفق کرلے یا اس سے متفق ہو جائے " مگر اب جب سر پر آ کر پڑی تو معلوم ہوا - کہ خیالات میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے + مردانہ میں بیٹھ کر خود تاش اور گھر میں بٹھا کر تسکار کھیلنے اور کھلانے دونوں سے مجبور اور لاچار - خیالات کا اتفاق ہو تو کیونکر ؟ وہ اس کا حال سُننے سے گیا - یہ باہر جا کر سنانے سے رہی - ہاں مُلّا کی دوڑ مسجد کبھی کبھار کا ایک شعر بچپن کا سُنا سُنایا یاد تھا :-

ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے

اس پر البتہ عمل تھا جب تک وہ گھر میں نہ آتا - بیٹھی جاگتی رہتی - گرمی میں پنکھا - جاڑوں میں انگیٹھی - اس کی صورت دیکھی اور کھڑی ہو گئی - صبح صبح اس کے اُٹھنے سے پہلے نماز پڑھ پہلے اس کے واسطے تولیہ - منجن - پانی صابون سب رکھ دیا - پھر ساس کے پاس گئی - کھانا اس سے پہلے کھایا نہیں ناشتا اس سے قبل چھوا نہیں - تڑاقے کی گرمی میں رات رات بھر پنکھے

جھلے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں دن دن بھر انگیٹھیاں سُلگائیں۔ ساس کے سر
دُھلائے۔ سُسرے کے پاؤں دبائے۔ نند کے کپڑے سئے۔ بھانجا بھانجی
کے منہ دُھلائے۔ غرض اپنی طرف سے خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اور
یہ جو کچھ کیا۔ صرف ایک دم کی خاطر اور ایک توقع کے کارن مگر وہ خاطر فضول
اور توقع بے سُود تھی۔ دل تھا جس میں درد نہیں۔ آنکھیں تھیں۔ جن میں
مُروت نہیں۔ دماغ تھا جس میں عقل نہیں۔ اور انسان تھا جس میں احساس
نہیں۔ ساس کے ہاتھوں بدنصیب بہو پر سال بھر کے اندر یہ کچھ گزر گئی لیکن
پر چور بنی۔ خیرات پر مکّار۔ احتیاط پر دشمن۔ خموشی پر ناہنجار۔ مگر اس ظالم
نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بدنصیب بہوی تجھ پر کیا گذر گئی اور کیا گزر رہی ہے؟
اور گیا بھرم گیا گرہ کا مال گیا۔ توقیر جیسا لال گیا۔ لیکن خیال نہ آیا کسی بات
کا۔ اور دل نہ پسیجا کسی ظلم پر۔ تو اسی شوہر کا جس کو دن بھر ہا ہا ہو ہو اور
رات بھر ہی ہی ہا ہا کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ افضل اگر اس معاملے میں پہلا
اور سعیدہ دوسری مجرم ہے تو واقعات پر غور کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے
ہیں۔ کہ خدیجہ کا دامن بھی زاہرہ کے خون سے پاک نہیں عورت تھی۔ اور
عورت بھی گھر تیبن برتیبن۔ رانڈ دُکھیاری نہیں۔ بیوہ ہتھیاری نہیں بیوی
کی خدمات اور شوہر کے معاملات سے پُوری طرح آگاہ۔ اور میاں بیوی
کے تعلقات سے اچھّی طرح باخبر۔ عمر گزار چکی تھی۔ اور زندگی ختم۔ اپنے دل
پر ہاتھ رکھ کر دیکھتی۔ کہ اگر ایک رات میاں جلسے میں باہر رہ گیا۔ تو ساری
رات دروازے کی مٹی لے ڈالی۔ سونا حرام اور کھانا گناہ ہو گیا سمجھتی اور
غور کرتی۔ کہ پرائی جائی اس دن کو نہیں لائی۔ کہ تصویر تصویر کی طرح آئے اور
بُت کی طرح پڑ رہے۔ زبان دی ہے۔ اور وعدہ کیا ہے۔ کہ بیٹیوں کی طرح

رکھوں گی۔ اور بچّوں کی طرح سمجھوں گی۔ یہ ابتدا ہے۔ اس کی انتہا خراب۔ یہ آغاز ہے۔ اس کا انجام بُرا یہ بیج ہے اس کا پھل کڑوا۔ اور یہ وہ رات ہے جس کی صبح بُرے سے بڑا اور بدتر سے بدتر نتیجہ پیدا کرے گی مگر افسوس ہے اور سخت شوہر پر کم اور ساس پر زیادہ کہ شہ دے کر بیٹے کا ناس کیا دیکھا۔ اور چُپ رہی۔ سُنا اور نہ بولی۔

زائرہ اپنی طرف سے تنصیر کا دل فتح کرنے میں کمی نہ کر رہی تھی۔ کیا جو کر سکتی تھی۔ اور کرتی تھی جو ممکن تھا۔ مگر ضرورت تھی کہ اس کی کوششوں میں خدیجہ مددگار ہوتی اور اگر ذات کی شریف۔ زبان کی سچّی اور دل کی اچھّی ہوتی تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتی۔ جب تک تنصیر زائرہ کا غلام نہیں غمگسار شوہر اور عاشق زار نہیں عمر بقیہ کا سچّا مددگار نہ ہو جاتا۔

دو سال کے قریب اسی طرح نشتم پشتم گزرے اور باوجود ناکامی کے آثار پوری طرح ظاہر ہو جانے کے زائرہ اب بھی ساس کی اطاعت اور شوہر کی خدمت میں اسی طرح لپٹی رہی۔ مگر تنصیر جواب تک بیوی کی طرف سے لاپرواہ تھا۔ ایسا متنفّر تو نہیں مگر ذرا کھنچنے لگا۔ روپے کی کمی نہ تھی مگر پھر بھی مختار نہ تھا۔ لینا جب حاجت ہوتی اور مانگتا جس وقت ضرورت پیش آتی۔ ضرورت کبھی رُکی نہیں اور حاجت کبھی اٹکی نہیں۔ مگر پھر بھی اتنا تھا کہ باپ سے کچھ لیتا یا ماں کچھ دیتی تو پوچھ لیتے کہ کیا لیا اور کہاں اُٹھایا۔ مگر باپ کا مرنا تھا کہ بیس ہزار روپیہ سال کا مالک اکیلا بنا۔ پوچھنا نہ کچھنا اجازت نہ حکم۔ جو جی چاہا سو کیا اور جہاں جی چاہا وہاں اُٹھایا۔

(۹)

جوان بچّہ نازوں کا پلا اور ارمانوں کا بڑھا تھا۔ باپ کی روک ٹوک رہی

نہیں۔ ماں کی سُنتا خاک اور ماں کہتی ہی کیوں؟ روپیہ ہاتھ میں آتے ہی
آزاد ہو گیا+ صحبت بچپن ہی سے خراب تھی۔ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔
جیسے جاہل آپ تھے۔ ویسے ہی دوست بھی میسّر آئے۔ باپ کی زندگی تک
پھر بہت غنیمت تھا کہ اتنی آزادی نہ تھی۔ انسانیت سے تو وہ مرحوم بھی ہزاروں
ہی کوس دُور تھے۔ مگر روپے کے عاشق تھے۔ اور نہ کیوں ہوتے۔ محنت
سے کمایا۔ مصیبت سے پیدا کیا۔ پچیس تیس ہزار کے علاقے کو اپنے چلن سے
لاکھ دس لاکھ تک پہنچا دیا+ گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں کہ چیل انڈا چھوڑے۔
چاہتے تو خس کی ٹٹیوں اور برقی پنکھوں میں بیٹھتے۔ مگر طبیعت کی یہ کیفیت
اور مزاج کا یہ حال تھا۔ کہ گاڑی نہ چھتری۔ منہ پر رومال ڈالا۔ اور بارہ
کوس گاؤں کا دھاوا باندھ لیا+ نماز کے اللہ بخشے پابند کیا ہوتے پڑھی
نہ ناغہ کی۔ مگر مغرب سے پہلے کھیت میں جا پہنچے+ ان کی آنکھ کا بند ہونا
تھا۔ کہ سب بھائیوں نے اپنا اپنا حِصّہ الگ بانٹ لیا+ بھائیوں کی یہ
حالت دیکھ کر بہنیں کیوں چُپ رہتیں؟ اُنہوں نے بھی اپنا ترکہ لے لیا
خدیجہ اگر نیّت کی سچّی اور انسانیّت کی اچھّی ہوتی۔ تو اس کی زندگی جھاڑو کا
بندھن ہوتی۔ انتظام کی موت الو کبھی نہ تھی۔ مرا عمر طبعی کو پہنچ کر۔ اولاد سے
بھگت بھگتا کر بیٹے تھے۔ بیٹیاں تھیں۔ بہوئیں تھیں۔ داماد تھے۔ ان
سب پر حکومت کرتی اور خوش رہتی۔ مگر یہ اس کی بدنیّتی کا پہلا ثمر تھا کہ
سب بتّر بتّر ہو گئے+ مت کر ساس بُرائی۔ تیرے بھی آگے جائی۔ خدیجہ اگر
زائرہ کو کلیجے سے لگاتی تو یہ روز بد اس کو دیکھنا نہ پڑتا۔ تقصیر اوّل تو ہوا
مال دار اس پر خود مختار اور دونوں پر طُرّہ مزاج میں وارفتگی۔ اور طبیعت
میں شوق+ دن رات دوستوں کا جمگھٹا اور یاروں کا جلسہ تھا جھوٹ

اس کا وظیفہ تھا۔ قسمیں اس کو حفظ۔ وعدہ خلافی اس کا کھیل تھا۔ خود غرضی
اس کا کام۔ نفس پروری اس کی طبیعت اور خوشامد اس کی عادت۔ بےشرمی
اس کی گھٹی میں۔ بےحیائی اس کی طبیعت میں + خدا کی شان تھی اتنا بڑا
رئیس۔ انسانی زندگی کی بدترین تصویر اور قابل ملامت نمونہ تھا + مرغ
لڑتے۔ کنکوے اڑتے۔ بٹیریں پلتیں۔ ناچ ہوتے۔ باجے بجتے غرض
ہر وقت کچھ نہ کچھ سوانگ ہوتا رہتا + دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مشکل
سے اس کو تین چار گھنٹوں کی فرصت ہوتی + تین بچوں کا باپ تھا۔ ننھا
نہیں اندھا نہیں انجام سوچتا اور نتیجے پر نظر ڈالتا۔ مگر ایسے وقت تو
گھڑا ہی نہ گیا تھا + رات کو بھی جب نیند سے مجبور اور لاچار ہو جاتا۔ تو کبھی
دو اور کبھی تین بجے اندر آجاتا۔ اور کبھی مردانے میں پڑ کر سو جاتا + دوست
بھی خدا کی عنایت سے ایسے ملے تھے کہ دو دو تین تین دن گھر جانے کا
نام نہ لیتے سال بھر کے قریب اس طرح گزرا۔ اور ایک سالم گاؤں۔ دو مکان
اور تین دو کانیں صاف نکل گئیں تنصیر کی زندگی کا یہ دور بھی عجیب تھا۔ بیوی
تو خیر اس کی رائے میں محکوم ہی تھی۔ اور اتنا حق نہ رکھتی تھی۔ کہ اُف کر سکے۔
مگر ماں جس کے پاؤں کے نیچے جنت تھی۔ اور جو ہانکے پکارے اور کھلے
خزانے دھڑ دھڑ کوستی تھی۔ اس کی بھی وہ سُننا تو درکنار۔ بات تک نہ پوچھتا
تھا + خرچ رہے بدستور اور صحبت رہی وہی۔ آمدنی ہوئی کم اور قرض
خواہوں نے کھینچا ہاتھ۔ اب وہ بات کیونکر بنتی ۱۹ انجام کا سوچ پہلے تھا
نہ اب ہوا۔ اور یہی ہوتا تو یہاں تک نوبت ہی کیوں پہنچتی۔ زائرہ پورے
دن تھی۔ زچہ خانہ سر پر تھا۔ سانس پہلے ہی کنارے ہو چکی تھی تنصیر اس دن
کو پیدا ہوا ہی نہ تھا۔ کہ پرائی تکلیف یا دوسرے کے درد سے متاثر ہوتا۔

اس کی ساری دُنیا محض اپنی ذات تک محدود تھی۔ بہت بڑی عنایت بیوی یا بچّوں پر کی تو یہ کہ مٹھائی لایا۔ کھانے بیٹھا۔ بیوی کی صلاح پوچھ۔ بچّوں کو بھورا بھورا دے آپ کھالی۔ ہاتھ دھو چلتا ہُوا۔ نو برس ہیں دُکھ بھی ہُوا بیماری۔ جننا بھی اور مرنا بھی۔ مگر اس اللہ کے بندے نے کبھی بیوی سے نہ پُوچھا۔ کہ کیا ہُوا۔ کیا ہے اور کیا ہو گا؟

زائرہ کی ماں بہت بیمار پڑی بخار ایسا رہا کہ اکیس دن ہو گئے جنبش نہ کی۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی اور اُٹھنے بیٹھنے سے مجبور ہو گئی۔ تو سعیدہ اپنی اور افضل بیوی کی زندگی سے مایُوس ہو گئے۔ دوپہر کا وقت تھا کہ سعیدہ نے میاں سے کہا۔ یہ میرا آخری وقت ہے اور چل چلاؤ کا زمانہ کیا خبر دن ہو یا رات کس وقت دنیا سے اُٹھ جاؤں۔ میرے سب بچے آنکھ کے سامنے ہیں۔ مگر زائرہ کی صُورت کو آنکھیں ترس رہی اور دل پھڑک رہا ہے۔ اگر اتنا رحم کرو کہ اس کی صُورت دکھا دو۔ تو خوش و خُرّم ہنستی بولتی دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ اب کوئی ارمان نہیں۔ صرف اتنا چاہتی ہُوں کہ ایک دفعہ زائرہ کو اَور کلیجے سے لگاؤں۔ خدیجہ ایسی تنگ دل نہیں۔ کہ اس موقعہ پر بھی کڑ بنے اور مرتی ہوئی ماں کو بچھڑتی ہوئی بچّی سے نہ ملنے دے۔ آج دوپہر سے سانس پھُول رہا ہے۔ کیا خبر کیا ہو کیا نہ ہو۔ میری جان بچّی یہیں پڑی رہے گی۔ اور وہ بھی روئے گی کہ ماں کا آخری دیدار دیکھنا نصیب نہ ہُوا۔ میری بچّی صابر اور بے زبان ہے۔ اگر اجازت نہ ملے گی تو اُف نہ کرے گی۔ مگر اپنی طرف سے کہلا بھیجو۔ میرا یہ ارمان بھی نکل جائے۔ افضل نے اسی وقت آدمی بھیج دیا۔ زائرہ ماں کی بیماری تو بہت دنوں سے سُن رہی تھی۔ اور ماں کی صورت دیکھنے کو مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس وقت جو ماما

سے نے آکر کہا۔ تو بلبلا اُٹھی اور روتی ہوئی ساس کے پاس گئی۔ اس کے قدموں پر گر پڑی اور کہنے لگی "اماں جان کے بچنے کی اُمید نہیں ہے۔ اتنی اجازت دے دیجئے کہ ان کی صورت دیکھ لوں "

ساس۔ بیٹی میں اجازت دینے والی کون؟ میں تو تم پر سے ہاتھ اُٹھا چکی۔ کہ تم نے ماں سمجھا نہ اُس نے + تم آزاد و مختار ہیں دونوں کے مزاج سے ڈرتی ہوں۔ وہ بھیجنے والا۔ تم جانے والی۔ ہرج کیا ہے۔ کیا بیٹیاں میکے جاتی نہیں؟ پوچھ لو اور چلی جاؤ۔

بہو۔ وہ تو کہیں رات کو خدا جانے کس وقت آدیں۔ آپ فرمادیں تو میں چلی جاؤں۔ ایسا ہی ہے تو کھڑی ڈولی جاؤں اور صورت دیکھ چلی آؤں

ساس۔ نہیں بیوی میں اپنے ذمّے بُرائی نہیں لیتی۔ تم تو مزے سے چلی جاؤ۔ وہ میری جان کو آجائے۔ رات کو پوچھ لینا۔ صبح کو چلی جانا + مرنا نہ ہُوا ہنسی کھیل ہو گیا۔ بیمار ہیں۔ اچھّی ہو جائیں گی +

ساس کا جواب سُن کر مایوس آ بیٹھی۔ بیٹھنا تھا کہ ماں کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی۔ بیتاب ہو کر اُٹھی۔ اِدھر ٹہلی۔ اُدھر ٹہلی۔ دل اُمنڈ رہا تھا۔ روتی تھی۔ پھڑ پھڑاتی تھی۔ اور اس جانور کی طرح جو پنجرے میں سر پٹک پٹک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ چُپ ہو جاتی تھی + کچھ خیال آیا ایک پرچہ لکھا اور بھیج دیا۔ کہ میاں کے پاس لے جاؤ۔ یہ عمر بھر میں پہلا پرچہ۔ پہلی درخواست۔ پہلی تکلیف تھی جو بیوی نے میاں کو۔ نائرہ نے تنصیر کو اور غریب کی بیٹی نے امیر کے بیٹے کو دی + پڑھنا تھوڑا بہت لکھنا ٹوٹا پھوٹا آتا تھا۔ مگر تا شہ ہو رہا تھا۔ کہیں اُڑ رہی تھیں۔ پڑھا اور پڑھ کر خاموش ہو گیا

قمری مہینے کی ابتدائی تاریخوں نے چادرِ مہتاب رُوئے زمین پر پھیلا دی
پیپل کے پتّوں نے اس چاندنی کی تہ میں سعیدہ کی موت پنہاں دیکھی تو رات
کا سنّاٹا سر پر چھا گیا۔ اور بیمار کا کرب کم ہُوا + سرسام نے ہوش و حواس مختل
کر دیئے تھے۔ افضل اور بچے چاروں طرف پٹی کے پاس بیٹھے تھے + دفعتاً
سعیدہ نے کروٹ لی۔ آنکھیں بند تھیں۔ کہنے لگی "میں دُنیا سے اُٹھتی ہوں
یہ میرے پچھلے سانس اور آخری گھڑیاں ہیں۔ میں نے اپنے بچّوں کو دیکھ
لیا۔ یہ میری عمر بھر کی پُونجی اور زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔ دُعا کرو کہ خوش رہیں
میرا دم حلق میں اٹک رہا ہے۔ اور میری جان پر بن رہی ہے سخت اذیت
اور غضب کی تکلیف ہے۔ میری روح اب ایک صُورت کی بھُوکی ہے اور
وہ میری پیاری زائرہ ہے + ہے کوئی اللہ کا بندہ جو مجھ کو اس کی صورت
دکھا دے" اتنا کہہ کر سعیدہ پھر خاموش ہوئی۔ درخت کے پتّے اس کی غربت
پر کفِ افسوس مل رہے تھے + ٹھیک دو بجے ہوں گے کہ اس نے پھر
آنکھ کھولی اور کہا۔ "زائرہ آئی۔ اس کی ڈولی اتروا لو" پھر وہی خاموشی اور
سنّاٹا تھا۔ بچّوں کی آنکھ سے زار قطار آنسوؤں کی جھڑیاں لگ رہی تھیں +
افضل تو رو نہ رہا تھا۔ مگر اس کی حالت بچّوں سے بدتر تھی۔ عمر بھر کا ساتھ چھُوٹ
اور بتیس برس کا گھر اُجڑ رہا تھا + تکلیف سخت تھی۔ اور کسی کروٹ مریضہ کو
چین نہ تھا۔ اسلم نے باپ کے اشارے اور بہنوں کے کہنے سے لیٰسین
شروع کی۔ پہلی مبین تک پہنچا تھا۔ کہ پھر اُٹھی بیٹے کے آگے ہاتھ جوڑے
اور کہا "خدا کے واسطے زائرہ کی صُورت دکھا دو + سب دم بخود تھے۔ بڑی
اور منجھلی کو بُلا کر گلے سے لگایا۔ دُعا دی اور کہا "میری مغفرت کی دعا کرو"
آپ کلمہ پڑھا۔ سب کو پڑھوایا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور پھر وہی حالت

طاری ہوئی۔ دونوں ہاتھ اُٹھاتی تھی۔ اور کلیجے سے لگاتی تھی۔ صبح صادق کا سہانا وقت تھا کہ اس نے بآواز بلند دو دفعہ کہا۔

"زائرہ..... زائرہ..... ہائے زا..... تیسری دفعہ نام پورا نہ ہوا تھا کہ دُنیا سے رخصت ہوئی۔ زائرہ کی حالت تو مردوں سے بدتر تھی۔ اس کی آنکھیں دروازے کو لگی ہوئی تھیں۔ اور سوچ رہی تھی۔ کہ شاید اب آکر کہیں گے کہ "چلی جاؤ"۔ مگر شام رخصت ہوئی اور وہ نہ آیا۔ کئی دفعہ دروازے تک گئی۔ آنکھیں روتے روتے سُرخ ہوگئیں۔ دیوانوں کی طرح چاروں طرف بلکتی پھرتی تھی۔ آدھی رات کے قریب باہر کے کٹھڑوں کی آواز بند ہوئی اور نصیر اندر آیا۔ تو ماں نے کہا:۔

"بھائی تمہاری ساس بیمار ہے۔ بیوی کو بھیج دو"۔

"زائرہ اپنی عادت کے موافق پنکھا جھلنے لگی۔ کھانا لاکر رکھا جب وہ کھا چکا تو کہنے لگی:۔

"اماں کے بچنے کی اُمید نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو چلی جاؤں"۔

نصیر۔ چلی جاؤ۔ میں نے کیا منع کیا ہے؟

زائرہ۔ اگر اس وقت ڈولی مل جائے۔ تو میں ابھی چلی جاؤں۔

نصیر۔ اب کون وقت ہے۔ اوّل تو ڈولی ملے گی ہی نہیں۔ دوسرے ڈھونڈنے کون جائے گا! صبح کو چلی جانا۔

اتنا کہہ کر پلنگ پر لیٹنا تھا کہ خراٹوں کی آواز شروع ہوگئی۔ زائرہ کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ کبھی کمرے میں تھی۔ کبھی انگنائی میں۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ دُعا مانگی۔ روتی رہی۔ گڑگڑاتی رہی۔ بلبلاتی رہی۔ گھنٹے کو دیکھتی تھی آسمان کو گھورتی تھی۔ مگر صبح کسی طرح نہ ہوتی تھی۔ خدا خدا کرکے سب سے

پہلے مرغ نے وداعِ شب کا مژدہ اور اس کے بعد ماما نے رحلتِ سعیدہ کی خبر زائرہ کے کان تک پہنچائی۔ ایک چیخ ماری اور یہ کہہ کر چپ ہو گئی:-

"ہائے میری اماں!"

بیوی کی آواز سے تنصیر بھی اٹھ بیٹھا۔ ساس کی خبر سن کر مسکرایا۔ اور کہا۔

"اچھا لڑھک گئیں؟"

خدیجہ اٹھ کر آئی اور ماما نے ڈولی منگوا اسی وقت بہو کو میکے چلتا کیا۔ زائرہ روتی ہوئی ڈولی میں بیٹھی۔ بلکتی ہوئی چلی۔ اور تڑپتی ہوئی اتری اور گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کے مردے سے لپٹ گئی۔ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر افضل نے زائرہ کو سامنے بٹھایا۔ اور کہا:-

"بیٹی میں تمہاری آنکھ سے کیسا ہی اوجھل اور کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں مگر تمہارے حالات سے بے خبر اور تکالیف سے ناآشنا نہیں + تم پر جو گزری اور گزر رہی ہے۔ میں رتی رتی سن اور پل پل دیکھ رہا ہوں۔ تم آنکھ سے دیکھتی ہو۔ اور میں دل سے۔ تمہارے دل پر گزر رہی ہے اور میری روح پر + میں نے تمہارے معاملے میں جو کچھ کیا۔ وہ میرا ایمان تھا۔ اور میں خدا کو شاہد کرتا ہوں۔ کہ میری نیت بخیر تھی۔ میں نے بھرا پُرا گھر کھاتے پیتے لوگ اور شریف خاندان دیکھا۔ مگر مجھے خبر نہ تھی۔ کہ تمہاری تقدیر اور میری قسمت سے وہ خدیجہ جس نے میرے پاؤں میں دوپٹہ رکھا۔ اور وہ تنصیر جس نے گھر کی مٹی لے ڈالی ایسے فرنٹ ہو جائیں گے + میں مسلمان ہوں۔ مجھ کو مرنا ہے مگر میں ڈر رہا ہوں۔ کہ اس غلطی کی باز پرس ہو گی۔ لیکن میرے دل کا حال اور میرے خیال کی اصلیت جاننے والا صرف معبودِ حقیقی ہے۔ میں انسان تھا۔ دھوکے میں آ گیا۔ اور مغالطے میں پڑ گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ

تھی کہ یہ خوشامدیں جھوٹی۔ یہ دعوے غلط اور یہ اُمیدیں لغو ہیں۔ تم نے اب تک جو کچھ کیا۔ جس سعادت مندی سے ساس کو ساس جس اطاعت گزاری سے شوہر کو شوہر سمجھا۔ یہ تمہاری شرافت کا ثبوت اور صداقت کی دلیل ہے تم نے بزرگوں کی آن رکھی۔ باپ دادا کی لاج رکھی۔ اور دُنیا کو دکھا دیا۔ کہ شریفوں کی بچیاں مصیبت کو راحت اور تکلیف کو امرت سمجھتی ہیں میں جانتا ہوں کہ تم کو زندہ ماں کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ مگر تمہاری شرافت کا تقاضا یہی تھا۔ جو تم نے کیا۔ مجھ کو معلوم ہے کہ تم نے ساس کی اطاعت شوہر کی خدمت میں کمی نہ کی۔ لیکن ہر ایک مسلمان بچی کا فرض اور نیک بیوی کے کام یہی ہیں۔ اب تمہاری بہتری سے نا اُمید اور سلوک سے مایوس ہوں۔ مگر باپ کی اس نصیحت کو جو شاید چند روز بعد وصیت ہو جائے ہمیشہ یاد رکھنا۔ کہ عجز میں فرق اور انکساری میں کمی نہ آئے۔ ماں چھوٹ چکی۔ اس کا جسم قبر میں جا پہنچا۔ مگر اس کی روح تمہارا صبر دیکھ رہی ہے۔ زائرہ۔ ایسا نہ ہو کہ تیری تیوری کابل ماں کے دودھ پر حرف لے آئے۔ تلخیاں شہد کے گھونٹ اور مظالم سر آنکھوں پر ہوں۔ دُنیا اسی کا نام ہے۔ ماں باپ کی موت ورثہ ہے صبر کرو۔ اور وہ کام کرو کہ اس ماں کی رُوح جو تمہاری طرف سے ناشاد و نامراد گئی۔ تمہارے گنوں سے جنت الفردوس میں باغ باغ ہو جائے۔ میں اس وقت اس مجمع میں تمہارے بہن بھائیوں کے سامنے۔ تمہاری موجودگی میں علے الاعلان کہتا ہوں۔ کہ تمہارے انتخاب کا بار مجھ پر۔ تمہاری مصائب کا ذمہ دار میں۔ اس لئے کہ میں قصور وار ہوں۔ رُو کر اور گڑگڑا کر تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ قیامت کے روز مجھ سے مواخذہ نہ کیجیو۔ کوئی تکلیف ہمیشہ اور کوئی خوشی سدا رہنے والی

نہیں۔ کوار پتے کا زمانہ ختم ہوا۔ تو اس وقت کی یہ تکلیفیں بھی نہ رہیں گی۔ ضرورت یہ ہے۔ کہ اس مصیبت میں جو آزمائش کا وقت اور پہچان کا موقع ہے۔ خاندانی شرافت اور نسوانی جوہر ہاتھ سے نہ جائے۔ زائرہ بیگم۔ اطاعت میں کسر اور خدمت میں کمی نہ ہو۔ بڈھے باپ کی درخواست خالی نہ جائے۔ اس سفید داڑھی کی آبرو اب تمہارے ہاتھ ہے ظلم پر ظلم ہوں ستم پر ستم ٹوٹیں مگر زبان سے شکایت اور لب سے اُف نہ نکلے۔ تمہاری ڈولی آگئی۔ بسم اللہ کرو۔ اور رخصت ہو۔"

باپ کہہ رہا تھا اور زائرہ کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ خاموش ہوا تو بلبلا کر اُٹھی اور قدموں پر گر پڑی۔ افضل باپ تھا۔ دل بھرا آرہا تھا۔ مگر جانتا تھا کہ ذرا آواز بھرائی تو گھر بھر کہرام مچادے گا۔ ضبط کرتا رہا۔ مگر زائرہ کا قدموں پر گرنا تھا کہ نہ سنبھل سکا۔ اس کو اُٹھا کر کلیجے سے لگایا۔ دل اُمنڈ رہا تھا چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ بچوں کی حالت اِدھر تو ماں کی رحلت سے۔ اُدھر باپ کی تقریر اور سب سے زیادہ بہن کی مصیبت سے ابتر ہو رہی تھی۔ سب بے قابو ہو گئے۔ اور وہ کہرام مچا۔ کہ در و دیوار تک رونے لگے۔

زائرہ اس حالت میں سب کو روتا چھوڑ چھاڑ ڈولی میں بیٹھ گھر آئی تو ساس نے گلے سے لگایا۔ اور تسلی تشفی دیتی رہی۔ مگر رات کو جب نصیر اندر آیا۔ اور بیوی کو اس حالت میں پایا۔ تو بہت ہنسا اور کہنے لگا۔ کہ

"مرنا سبھی کو ہے۔ مرنے پر کیا رونا۔"

(۱۰)

ماں کی موت نے زائرہ کے چھکے چھڑوا دیئے۔ راتوں روئی اور دنوں

تڑپی۔ مگر جو بات آج تھی۔ وہ کل نہیں۔ اور جو کل تھی۔ وہ پرسوں نہیں + دُنیا
کے دستور اور قدرت کے انتظام کے موافق صدمہ زائل ہوتے ہوتے مُعمولی
اور خیال دُور ہوتے ہوتے براے نام رہ گیا + کچھ بچّوں کی محبّت میں۔ کچھ
شوہر کی خدمت میں۔ کچھ ساس کی اطاعت میں۔ بغرض چند ہی روز میں سب
کچھ بھول بسر گئی + ہاں رات کو جب بچے کھیل کھلا کر۔ میاں کھا پی کر اور آپ
تھک ہار کر پڑتی۔ تو ماں کی تصویر سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس وقت البتہ
بے چین ہو جاتی۔ مگر بالآخر طبیعت اس کی بھی خوگر ہو گئی۔ اور ماں کے فراق
ابدی کی اذیّت معمولی فرقت رہ گئی + خدیجہ بہو اور بہو کے ساتھ بیٹے دونوں
سے ہاتھ اُٹھا چکی تھی اور الگ تھلگ رہتی تھی۔ مگر خوشی اور رضامندی سے
نہیں۔ مجبوری اور معذوری سے۔ اُس نے جس طرح شروع میں بہو کو دبایا
اگر بیٹے کو بھی قبضہ میں رکھتی۔ تو یہ دن نہ دیکھتی۔ کہ وہ بک رہی ہے وہ ہنس
رہا ہے۔ وہ رو رہی ہے وہ خوش ہو رہا ہے ٭

نصیر کی حالت میں باوجود اُس ابتری اور بدتری کے کہ جائداد کا بڑا
حصہ ختم اور علاقہ از سرتا پا تباہ و برباد۔ رونگٹا رونگٹا قرض اور تل تقاضوں
میں گرفتار تھا۔ اصلاح تو کیا خاک ہوتی دن دونی اور رات چوگنی ترقی تھی +
اصلاح نہ ہوئی نہ ہو سکتی تھی۔ جو عیوب اور نقائص بچپن ہی میں داخل سرشت
ہو چکے تھے۔ وہ اب بڑھتے بڑھتے اتنے بڑھ چکے تھے۔ کہ ہر عیب اور
نقص بجائے خود فطرت تھا + چاند سے لال۔ مینا سی بچیاں بیمار ہوتیں
اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا + ماں سے بڑی ساس مرتے مر گئی پھول اور
چالیسواں تو درکنار جنازے تک میں شریک نہ ہوا + وہی دن رات کے
شوق اور ہر وقت کے مشغلے۔ چند روز میں سب اُف ہو گیا۔ اور ایک

تعلیم نہ ہونے سے اس پر اور نہ صرف اس پر بلکہ اس کے تمام خاندان پر وہ تباہی آئی۔ کہ خدا دشمن پر بھی نہ لائے + بچّے بھوک سے بلک رہے ہیں اور وہ حلوا پوری لایا۔ اور کھا گیا۔ بیوی خاموش بیٹھی ہے۔ اور اس نے اپنے ہاتھ سے نہاری بگھاری اور چٹ کی ÷

قرض امانت تو تھی ہی نہیں۔ کہ جب ضرورت ہوئی گئے اور لے آئے مال موجود تھا۔ تو دام ملتے تھے۔ جب مال ہی نہ رہا۔ کیسا دینا اور کس کا لینا۔ چاروں طرف کوشش کی۔ گھوڑے دوڑائے۔ مگر پھوٹی کوڑی تک نہ ملی + نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ چاہے بچّے ایک ایک روٹی کمتی کھالیں۔ مگر مرغوں اور بٹیروں کے دانے میں فرق نہ آئے + یہ بھی کب تک اور کہاں تک؟ چند روز بعد اس کے بھی لالے پڑ گئے۔ پان سیر اناج صرف جانوروں کا صبح۔ پان سیر شام ایک روپے کا ہو گیا + اب بچّوں کے ساتھ جانوروں پر بھی ایک آدھ وقت دو تین مرتبہ صاف نکل گیا + ہاتھی لاکھ لٹے گا۔ پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اتنا کچھ کھو کر بھی تنصیر اگر سنبھل جاتا تو لاکھوں کا لال تھا۔ مگر سنبھلتی اس کی جوتی اور سوچتا اس کا صدقہ۔ بیوی موجود۔ بیوی کا زیور موجود۔ بیوی کے عزیز موجود تکلیف اُٹھانے کی وجہ اور دُکھ بھرنے کا سبب کیا؟ زائرہ کے پاس ایک انگوٹھی نہایت قیمتی اور خوب صورت تھی۔ اور یہ وہ تھی کہ سارے زیور میں اس کو عزیز تھی + ایک روز وہ حسب عادت آدھی رات کے وقت شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اور یہ سوچ رہی تھی۔ کہ خیر میری تو جیسی گذرنی تھی۔ گذر گئی۔ میرے ساتھ بچّوں کی کیسی مٹی پلید ہوئی + آٹھ آٹھ دس دس برس کے ہو گئے اور ایک حرف نہ پڑھا۔ ان کی زندگیاں باپ سے بدتر گذریں گی + یہی سوچ رہی تھی۔ کہ تنصیر آیا۔ پریشان تھا حیران تھا۔ کھانا نہ

کھایا۔ فقط آکر بیٹھ گیا۔ زائرہ میاں کو خاموش دیکھ کر بچوں کی آیندہ مصیبت بھول گئی اور اس کے پاس آکر کہا "خیر صلاح چُپ چُپ کیوں ہو؟"

تنصیر۔ کیا خاک خیر صلاح۔ ان جانوروں کی مصیبت پڑی ہوئی ہے بیچتا ہوں تو بکتے نہیں۔ رکھتا ہوں تو ہمت نہیں۔ مجھے تو یہ جانور اپنے بچوں سے زیادہ ہیں۔ صبح سے بھوکے ہیں۔ میں کس دل سے اپنا پیٹ بھر لوں۔ تمہارے پاس کچھ ہے؟

زائرہ۔ میرے پاس تو وہی گیارہ روپے تھے۔ جو تم اس روز لے گئے اب تو کچھ پیسے پڑے ہوئے ہیں:۔

تنصیر۔ اماں جان سے مانگنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ شریف ہوں تو مر جاؤں گا۔ اور نہ مانگوں گا۔ تم اپنی انگوٹھی دے دو۔ میں انشاء اللہ آٹھ دس روز میں چھڑوا دوں گا:۔

زائرہ۔ ہاں شوق سے لے جاؤ۔ حاضر ہے:۔

تنصیر۔ لاؤ تو ابھی دے دو؟

زائرہ۔ لو۔

انگوٹھی لے کر تنصیر نے کھانا کھایا۔ اور صبح کو اُٹھتے ہی گروی رکھ اپنی ضرورتیں پوری کرنی شروع کیں:۔

مصائب کا آغاز اگر سچ پوچھو تو زائرہ پر روزِ نکاح ہی سے ہوا لیکن نوعیت میں فرق تھا۔ ساس کی اذیت اور قسم کی۔ میاں کی رعونت دوسری قسم کی۔ اب یہ صورت تیسرا دور تھا۔ جس کی ہیئت بالکل ہی علیحدہ تھی۔ ڈیڑھ سو روپے کی انگوٹھی بڑھتے ہوئے خرچوں اور کھلے ہوئے دلوں میں کے دن کی؟ مختصر یہ کہ آج انگوٹھی۔ کل چھلے۔ پرسوں جھلنیاں اور اترسوں کڑے

ایک مہینے ہی مہینے کے اندر زائرہ کے پاس چاندی کا چھلا تک نہ رہا نیک کوکھ کی بیٹی تھی۔ اس کا پیٹھ پیچھا ہے۔ کبھی تیوری پر بل نہ لائی دے کر خوش۔ اور اتار کر نہال ہوئی۔ جب صفایا ہوچکا اور زیور نام کو نہ رہا۔ تو کپڑوں کی نوبت آئی۔ تین تین چار چار سو کے مصالحے سے پلے اور ٹکے جوڑے ظالم نے تیس تیس چالیس چالیس کو دے دیئے۔ مگر اس نیک بخت نے اُف نہ کی۔ اور بالآخر ایک وہ وقت بھی آگیا۔ کہ زائرہ کے پاس سوائے اس جوڑے کے جو بدن پر تھا۔ اور تین اُور جوڑوں کے جو بقچی میں تھے چیتھڑا تک نہ رہا + خدیجہ بہو سے بیزار تو ہمیشہ ہی رہی۔ شروع شروع میں کچھ کُنبے کی پاس داری۔ کچھ لائے کی لاج جو کچھ کرتی تھی ڈر کر۔ اور کہتی تھی سمجھ کر مگر سعیدہ کے مرتے ہی کھل کھیلی۔ آزادانہ کہتی اور بے باکانہ ڈانٹتی۔ زبان کو لگام نہ تھی۔ بات کو قیام نہ تھا تنصیر کا یہ رنگ کہ وہ ماں سے بات نہ کرتا۔ اور رات کو آکر بیوی کے کمرے میں پڑ رہنا خدیجہ کو نہ بھایا۔ نزلہ بر عضو ضعیف بیٹے کا تو کچھ کر نہ سکتی تھی۔ بہو کی صورت دیکھ دیکھ کُھنی جاتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ اتنا واسطہ بھی نہ رہے ٭

(۱۱)

قمر کی وہ انّا جس کو زائرہ نے چیچک کے موقع پر نہانے کو کہا تھا۔ بیوی کے ساتھ پھر آئی + عورت گُٹنی تھی اور ہمیشہ اس تاک میں کہ کسی طرح اس بڑبولی سے بدلا لے کر کلیجہ ٹھنڈا کروں + زائرہ کا وہ وقت اُور تھا اور یہ اُور + اس وقت کہنے کو سہی یا برائے نام ہزار برس کی نیو۔ گھر کی بہو اور مالدار کی بیوی تھی + اب نحس بہو۔ منحوس عورت اور فقیر کی بیوی تھی۔ اس وقت سنا بھی یا کچھ کہتی تھی۔ تو دبی زبان سے۔ اب یا یا اور آنا بھی بھر مُنہ جو جی چاہتا کہہ

لیتیں + جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔ کہ کپڑے میلے چکٹ۔ کان میں چاندی کا تار اور کمرے میں چاندنی تک نہیں۔ تو بہت پریشان ہوئی + بچوں کی گت یہ تھی کہ بیری کرتے۔ جھیری پاجامے تو ارادہ کیا کہ باپ کو لکھوں اور کچھ منگواؤں۔ مگر ہمت نہ پڑی + یہ خبر ہی نہ تھی۔ کہ میاں ایک دو دفعہ نہیں کئی بار سو سو اور پچاس پچاس دو دو اور چار چار لے آئے ہیں + یہ وہ وقت تھا کہ کھانا اور کپڑا دونوں کو ترس گئی۔ اکیلی کونے میں پڑی رہتی۔ جی چاہتا کہ ساس نندوں میں جاؤں اور بیٹھوں۔ لیکن حالت ایسی نہ صورت۔ جاتی کیا خاک اور بیٹھتی کیا پتھر؟ دن رات وہ تھی اور عالم تخیل۔ کبھی کتاب ہوتی۔ کبھی عمر گذشتہ کا خیال۔ آنکھوں پر زور تھا روتی اور رو کر چپ ہو جاتی + اتا کم بخت فکر میں تو مدت ہی سے تھی۔ خدیجہ نے ایک نیا جوڑا اس کو بنا کر دیا تھا چپکے سے جا زائرہ کے کمرے میں رکھ آئی۔ اور کہہ دیا کہ میرے کپڑے چوری چلے گئے + گھر بھر میں ڈھنڈیا مچی۔ کونا کونا اور چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ کرتہ۔ پاجامہ۔ دوپٹہ سوئی نہ تھے کہ چھپ جاتے + جب کہیں نہ ملے۔ تو نند نے کہا

دلہن تم اپنے ہاں دیکھ لو۔ وہاں تو کسی نے نہیں ڈال دیئے +

زائرہ۔ جی نہیں۔ یہاں کون لاتا۔ یہاں نہیں ہیں +

شام کے وقت زائرہ خاموش بیٹھی تھی۔ بچے بھوک سے پریشان اور رو رہے تھے۔ اُن کو بہلا کر لٹا دیا۔ اور تھپک کر سلا دیا + وہ سو گئے تو سوچنے لگی۔ اللہ اللہ کیا انقلاب ہے۔ دس سال کے اندر ہزاروں کا مال متاع صرف ہو گیا۔ کلیجے کے ٹکڑوں پر یہ وقت ہے کہ بلوں بلوں کرتے ہیں۔ اور ٹکڑا نصیب نہیں ہوتا۔ کیا کروں۔ ایک آدھ وقت کی تکلیف یا دو ایک روز کی مصیبت نہیں۔ عمر پڑی ہے کیا ہوگا۔ اور کیا کروں گی۔ کس۔ ایسے

بھیک مانگوں اور کس کو اپنا حال سناؤں۔ بہنوں کو لکھوں۔ بھائی سے کہوں۔ آبا کو بلاؤں۔ مگر بارہ مہینے کی مصیبت ہے۔ کون بٹائے گا۔ یہ تو ایسی آ کر پڑی کہ اب اُٹھتی دکھائی نہیں دیتی + موذن نے عشا کی اذان دی۔ اُٹھی وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ فرض پڑھ رہی تھی کہ انّا نے اپنی بیوی سے جا کر چپکے سے کہا میرے کپڑے دُلہن بیوی کے کمرے میں رکھے ہیں؟

بیٹی۔ اے لو اماں انّا کہہ رہی ہے۔ کپڑے دُلہن کے ہاں ہیں ٭

امّاں۔ سچ کہو۔ دیکھوں تو سہی ٭

آگے آگے انّا۔ پیچھے پیچھے دونوں ماں بیٹیاں۔ انّا نے دری کے نیچے سے کپڑے نکال کر دکھائے اور کہا "مجھے کیا خبر تھی کہ گھر میں چور پڑ رہے ہیں مجبوراً ناد دکھیاری پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ لینا تھا تو ساس کا لیتیں نند کا لیتیں۔ میں کون ٭

ساس۔ بیٹی دُلہن غضب کیا۔ میں جیتی بیٹھی تھی۔ کپڑے نہیں تھے تو مجھ سے مانگتیں۔ میں اپنا جوڑا دے دیتی ٭

نند۔ توبہ یا اللہ توبہ!

تینوں ایک منہ تھیں کہ زائرہ نے سلام پھیرا اور ساس کی طرف دیکھ کر کہا "اماں جان اس میں شک نہیں کہ کپڑے میرے پاس نہیں ہیں مگر چور نہیں ہوں۔ خدا گواہ ہے میں نے آنکھ سے بھی نہیں دیکھے ٭

انّا۔ کپڑوں کے پاؤں لگ گئے کہ خود چلے آئے۔ انہوں نے آنکھ سے نہیں دیکھے ٭

ساس۔ بیٹی ایسی بات کیوں کہتی ہو جو عقل میں نہ آئے۔ خدا کو کیوں گواہ کرتی ہو۔ ایسی نمازیں بھی کس کام کی دل کا یہ حال اور ظاہر کی یہ

کیفیت!

زاہدہ۔ میرا کہنا اگر قابل اعتبار نہیں تو میری تقدیر۔ مگر میں سچّی ہوں اور میرے سچ کا گواہ خدا کے سوا کوئی نہیں۔ کہ میں بے قصور ہوں۔

میاں آ گیا تھا۔ بیوی کی چوری کا حال سُن کر پہلے تو چپکا ہو گیا۔ اور پھر ماں سے کہنے لگا:۔

"تم ہی کر کے لائیں۔ چور تھی تو اور مکّار تھی تو۔ میں تو چھانٹ کر نہیں لایا"

ماں۔ بیٹا دُنیا لاتی ہے۔ مجھے پیٹ کے گنُوں کی خبر تھی۔ کپڑے نہیں تھے تو مجھ سے مانگ لیتیں۔

بیٹا۔ جو مزا چوری میں ہے۔ وہ مُنہ سے مانگنے میں تھوڑا ہی ہے؟

زاہدہ۔ میں جا نماز پر بیٹھی ہوں مسلمان ہوں۔ اور تم سب بھی مسلمان ہو۔ ایمان سے کہہ رہی ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ مجھ کو رسوا نہ کرو میرا قصور نہیں ہے۔

(۱۲)

نیند کا آنا اس الزام کے بعد بدنامی ہو کر مشکل نہیں ناممکن تھا۔ مرغ گرفتار کی طرح مایوس بیمار کی مانند پھڑ پھڑا اور تڑپ رہی تھی۔ کہتی تھی اس میں شک نہیں کہ یہ مالدار ہیں۔ صاحب ثروت و حشمت۔ مگر میں بھی سدا کی ایسی ہی نہیں ہوں۔ آج فقیر ہوں مگر میرا باپ جیتا جاگتا۔ کھاتا پیتا شہر میں موجود ہے۔ ان کو میری آبرو لے کر۔ میری عزت ڈبو کر۔ مجھے الزام لگا کر مجھ پر ظلم رکھ کر کیا ملا؟ میں نے آج تک ساس سے۔ نند سے۔ میاں سے نند کی آنا سے کبھی بُرائی نہیں کی تھی۔ اس سلوک کی مستحق اور اس سزا کی سزاوار نہ تھی۔ نتھالی گری جھنکار ہوئی۔ کیا خبر بھری تھی یا خالی۔ ہاتھ چھینے اور

خبر دینے والی نہیں۔ سارا شہر سُنے گا۔ برادری میں پہنچے گی۔ عزیز سُنیں گے کیا کہیں گے؟ پیدا ہوتے ہی مر جاتی اور اس دن کو زندہ نہ رہتی۔ کہ میری وجہ سے خاندان کی آبرو اور بڑوں کی عزت اس طرح سے برباد ہو" ان ہی خیالات میں اُلجھ رہی تھی۔ کہ بڑا بچہ بھوک سے بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھا اور لگا کھانا مانگنے آئی گود میں لیا۔ چمکارا بہلایا۔ مگر بھوکا تھا۔ باتوں سے کیا مانتا آنکھ تنصیبر کی بھی کھل گئی۔ مگر کر کیا سکتا تھا۔ دادی نے لاکر تھوڑا سا کھانا دیا۔ اور کہا دُلہن بیٹی۔ تم تو غیروں کا گھر سمجھ رہی ہو۔ بچے تو میرے اپنے ہیں۔ آخر اتنا کچھ پک رہا ہے۔ منگوا لیتیں، مضایقہ کیا تھا؟

تنصیبر۔ وہ تو میری نیند کو اُجاڑ نا تھا۔ میں نے خود کئی دفعہ کہہ دیا ہے کہ اور بر سویرا آماں کے ہاں سے منگوا لیا کرو۔ لیکن سُنتا کون ہے؟

ساس کھانا دے کر چلی گئیں۔ بچہ سو رہا تنصیبر پڑ رہا۔ ذائرہ کو نیند کہاں۔ اسی طرح تڑپتی رہی۔ نیند تھی نہ بھوک۔ روتی تھی اور کہتی تھی "تقدیر میں یہ بدنامی لکھی تھی۔ اور میں اس وقت زندہ رہی تھی۔ کہ سسرال میں آکر چور بنوں۔ ہائے میری قسمت۔ آنا مجھ کو چور کہے۔ ماما ئیں مجھے چور کہیں۔ اور میں زندہ ہوں، باہر آئی تو شب سیاہ ہر سمت چھائی ہوئی تھی۔ تارے بساطِ فلک پر چمک چمک کر ماند ہو رہے تھے۔ اور ذائرہ بدنصیب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ کہتی تھی کہ اب زندگی بیکار اور جینا بے سود ہے۔ اس زندگی سے موت اور ایسے جینے سے نہ جینا اچھا۔ خدا میرا پردہ ڈھانک لے۔ پھر خیال آتا تھا کون بیٹھا ہے جو میرے بچوں کو کلیجے سے لگائے گا۔ بھلا یہ بھائی بھاوج کس کے۔ بہنیں اپنے اپنے گھر کی۔ ابّا خود چلن ہاروں میں ہیں۔ یہ کیڑے میرے سامنے پل جائیں۔ مگر جب تک تو خبر نہیں۔ تقدیر کیا

کیا تماشے اور کیسی کیسی سیریں دکھائے گی + خیالات کی رَو اسی طرح آ اور جا رہی تھی۔ کہ لقا کبوتر کا جوڑا جو میاں کو اتنا عزیز تھا۔ کہ اپنی الماری میں بند کر کے سوتے تھے۔ پھڑ پھڑایا۔ گھبرا کر اُٹھی۔ دیکھتی ہے تو بلّی + چیخی چلائی مگر بلّی کبوتر لے سیدھی ہولی + میاں ہوشیار ہُوا۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ اس کا بس چلتا۔ تو بیوی اور بچّوں کو کبوتر پر قربان کر دیتا + بڑا بچّہ پاس کھڑا تھا۔ اس کے تھپڑ مارا۔ اور بیوی سے پوچھا "الماری کا کھٹکا کیوں نہ لگایا"؟ کیسا نازک وقت اور عبرت انگیز سماں تھا۔ ایک بے قصور بیوی نیچی نگاہ کئے خاموش کھڑی تھی۔ اور ایک بے حس۔ بے عقل۔ سنگ دل شوہر آپے سے باہر برابر کھڑا آفت بپا کر رہا تھا + چیخنے کی آواز گھر کے باہر اور چلّانے کا غل سڑک تک پہنچ رہا تھا۔ مگر نہ پروا کی۔ تو خدیجہ اور اُس کی بیٹی نے کہ آنکھوں کے سامنے اور چبوترے کے نیچے یہ ہنگامہ تھا۔ اس قدر غصّے اور فضیحتی پر بھی صبر نہ آسکا۔ تو بیوی کو دھکا دیا۔ اور کہا "جا کمبخت فقیرنی۔ آنکھوں کے سامنے سے غارت ہو جا"۔ گر پڑی۔ بازو میں چوٹ لگی۔ مگر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چلا گیا تو اپنی چوٹ بھول پھول کو گود میں لیا۔ کہ تھپڑ کہاں لگا + بچّہ باپ کے غصّے سے سہم کر خاموش ہو گیا تھا۔ مگر ماں کے گود میں لیتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زاہرہ جس کے ننھے سے بازو کو ماں باپ نے ہاتھوں چھاؤں کر کے ماں نے سیانا اور باپ نے بڑا کیا۔ جس کو وہ پھول سمجھتے تھے۔ اور جس کو پال پوس کر اُنھوں نے قانون فطرت کے بموجب ایک غیر شخص کے سپرد اس توقع پر کیا۔ کہ جس پھول کو خونِ جگر سے سینچ کر کھلایا اس کی مہکار سے یہ اپنا دماغ خوش اور آنکھیں تر و تازہ کرے گا۔ آج اس کی یہ درگت ہوئی کہ شوہر کے ظالم ہاتھوں نے اس کو صندوقچے پر پھینک دیا + روئی اور خون کے آنسو ڈلا

سے روئی۔ ڈری اور آیندہ کے اندیشے سے ڈری۔ کہ جس غصے کی ابتدا یہ ہے اس کی انتہا کیا ہوگی۔ آج تک ہاتھ نہ اُٹھایا تھا اب اس کی بھی نوبت آگئی۔ کل کو لکڑی سے ماریں۔ بید سے ماریں۔ کیا کریں۔ کیا نہ کریں۔ کھٹکا لگا نا میرا کام نہ تھا۔ خود بند کرتے تھے۔ بیں روز کرتی۔ یا مجھ کو کہہ دیتے۔ تو قصوروار تھی۔ غلطی ممکن۔ اور قصور نا ممکن نہیں۔ لیکن بے قصور کا حشر یہ ہُوا۔ تو قصوروار کی سزا کیا ہوگی۔ کانپ اُٹھی۔ غیرت کے مارے دوپہر تک کونے میں پڑی روتی رہی۔ چوری کا الزام اور دھکّے کی چوٹ ایسی نہ تھی۔ کہ زائرہ آسانی سے بھول جاتی۔ جی نہ چاہا کہ ساس کو۔ دل نے گوارا نہ کیا کہ نند کو۔ غیرت نے اجازت نہ دی کہ ماماؤں کو۔ انّا کو کھلائی کو دداکو اب یہ صورت دکھاؤں۔ شام کو میاں سے کہا اجازت دو تو دو چار روز کے واسطے ابّا جان کے ہاں ہو آؤں۔

تنصیر۔ شوق سے۔ منع کس نے کیا ہے۔

میاں کی اجازت پاتے ہی زائرہ میکے چلی گئی۔ دوسرے روز خدیجہ نے ماما بھیج کر بچوں کو بلوا لیا۔ اور تیسرے روز جب افضل نے بچوں کو بلایا تو تنصیر نے کہلا بھیجا۔ بچوں کو جب فرصت ہوگی۔ آجائیں گے۔ وہ گئی ہیں پیٹ بھر کر رہ لیں۔

(۱۳)

تنصیر کے یہ الفاظ سُن کر نہ تو افضل کی غیرت نے۔ نہ زائرہ کی حمیت نے یہ تقاضا کیا۔ کہ وہ بے غیرت بن سکے اور یہ بے حمیت ہو کر وہ سسرال بھیج دے۔ اور یہ چلی جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ افضل کو بیٹی دو بھر اور زائرہ کو روٹی کی کمی نہ تھی۔ روٹی اس کو۔ اس کے کتوں کو۔ اب بھی کہ سعیدہ مر چکی اور

میکے کا دروازہ بند ہوگیا تھا۔ افضل کی زندگی تک لالوں کی لال تھی ‪٭
زائرہ جب تک یہاں رہتی اپنے ساتھ چار آدمیوں کو روٹی دے سکتی تھی۔ مگر مجبوری تھی۔ دنیا کے دستور اور لاچاری مسلمانوں کے موجودہ تمدن سے جس نے بیوی کو برابر کا شریک۔ مردوں کا لباس اور گھر کی ملکہ نہیں۔ شوہر کی لونڈی ساس سسروں کی زرخرید اور سسرال بھر کا شکار بنا دیا ٭
افضل نے ایک دو دفعہ یا بار ہا نہیں۔ ہمیشہ سُنا۔ دن رات سُنا کہ زائرہ کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ اس کا پھول سا چہرہ کملا۔ اور نازک دل مُرجھا گیا مگر ایک دن اتنی ہمت نہ پڑی کہ بیٹی کو بلا کر بٹھا لیتا۔ جانتا تھا کہ دُنیا اُلّو بنائے گی اور ہر شخص نام دھرے گا۔ خلع جو اسلامی زندگی کا صریح حکم اور عورت کا سب سے بڑا حامی فقط تھا مسلمان اس کو مسلمان ہوکر اور مسلمان بن کر صاف ہضم کر گئے۔ اور محض اپنی نفس پروری سے بہنوں کے بھائی۔ اور بیٹوں کے باپ بیوی کو رعیت بنا چکے۔ پنچوں کی زبان میرے لئے خاموش۔ عدالت کا دروازہ میرے لئے بند ہے۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ اور فقط میری کون سن لے گا۔ مزہ یہ ہے مسلمان دنیا بھر کے رواجوں کو پیٹ رہے ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ طلاق کے مقابلے میں خلع نے جو عورت کا جائز حق تھا کتنی بیویوں کو شوہر کے مظالم سے آزاد کیا۔ یہ تھے وہ خیال جنہوں نے اب تک افضل کو چوں نہ کرنے دی۔ مگر بیٹی کا آنا اور داماد کا پیغام اس کے چھیڑنے کو کافی تھا۔ اُس نے بیٹی کی دل جوئی میں کسر نہ کی پچاس روپے کا کپڑا اسی روز بیٹی کے آگے لا کر ڈال دیا۔ اچھے سے اچھا کھلاتا اور بہتر سے بہتر پہناتا۔ مگر مامتا کی آگ جب بھڑکتی۔ تو بچوں کو یاد کرکے زائرہ اس طرح روتی۔ کہ اس کے ساتھ بہنیں اور بھاوجیں تک رونے لگتیں۔ تو البتہ افضل خاموش

ہوجاتا ۔ غضب یہ تھا کہ چھوٹی بچی تنویر پندرہ روز کی دُودھ چھوٹی تھی جس وقت اس کا خیال آتا ۔ کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ۔ دیوانوں کی طرح چاروں طرف پھرتی اور سودائیوں کی طرح ایک ایک کا مُنہ تکتی ۔ ماماؤں سے کہا ۔ بھائیوں کی منت کی ۔ بہنوں کے آگے ہاتھ جوڑے کہ کوئی اللہ کا بندہ اتنا رحم کرے کہ ایک دفعہ دور ہی سے بچّوں کی صورت دکھا دے ۔ کوشش میں کمی کسی نے نہ کی ۔ بہنوں نے مامائیں بھیجیں ۔ بھاوجوں نے بھائی بھیجے مگر ظالموں کا دل نہ پسیجا ۔ اس دردنے زائرہ کی جان پر بنادی اب تک جو وقت پڑی ۔ وہ جھیلی ۔ جو مصیبت آئی وہ بھگتی ۔ مگر بچوں کا فراق ایسا نہ تھا کہ سنبھل جاتی ۔ اور دامنِ صبر ہاتھ سے نہ چھوٹتی ۔ مامتا جب زیادہ بیتاب کرتی ۔ تو ارادہ ہوتا ۔ کہ چلی جاؤں ۔ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوجاتی اس فراق نے صحت بگاڑدی ۔ حرارت رہنے لگی ۔ مگر مطلق خیال نہ کیا ۔ وہی بچوں کی ایک رٹ تھی جو ہر وقت زبان پر موجود تھی ۔ سوتی ہے ۔ تو ان کا خواب ۔ جاگتی ہے تو اُن کی تصویر ۔ جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی ۔ اور بخار ہر وقت رہنے لگا تو یہ سوچ کر کہ نہ معلوم جیوں یا مروں ۔ بغیر کہے سُنے مامتا کی آگ میں تڑپتی اور بخار میں ہلہلاتی ڈولی منگوا سُسرال پہنچی ۔ تنصیر باہر موجود تھا ۔ پوچھا کون ہے ؟ معلوم ہُوا بیوی ۔ پاس آیا اور کہا ” اب غیرت کہاں گئی ۔ کیوں آئی ہو ؟“

زائرہ ۔ بخار چڑھا ہوا ہے ۔ زندگی کا بھروسہ نہیں ۔ خدا کا واسطہ ایک دفعہ دُور سے بچّوں کی صورت دکھا دو ۔

تنصیر ۔ معاف کرو اور لمبی ہنو ۔

ناکام لوٹی ۔ ڈولی باہر نکلی تھی کہ سامنے سے ماما تنویر کو گود میں لے آئی صورت دیکھتے ہی پھڑک گئی ۔ اور ماما سے کہا اپنے بچّوں کا صدقہ دم بھر کو

میری بچی گود میں دے دے۔ ماما دینے کا ارادہ کر رہی تھی۔ کہ تنصیر آ گیا۔ اور بچی کو لے گھر میں چلا گیا۔

(۱۴)

بخار صدمہ کا تھا۔ روز بروز زیادہ اور لحہ بہ لحہ تیز ہُوا۔ خرابی یہ ہوئی کہ دوا نام کو نہ پی۔ علاج خاک نہ کیا۔ حالت دن بدن ردی ہونے لگی۔ بخار چڑھا ہوا ہے۔ جھلس رہی ہے۔ مگر خاموش پڑی بچوں کے خیال سے باتیں کر رہی ہے۔ ایک رات کہ سب جاگ رہے تھے۔ اسی حالت میں کہنے لگی۔ "تم سب مسلمان ہو۔ میرے کلمے کے گواہ رہنا۔ اب میری زندگی کا اعتبار نہیں ہے۔ کچھ دن کی مہمان اور کوئی دم کی ہوا کھا رہی ہُوں۔ خدا کے ہاں تم سب کے گریبان اور میرے ہاتھ ہوں گے۔ تم نے میرے کلیجے کے ٹکڑے مجھ سے چُھٹوا دیئے۔ تمہارے بچّے تمہاری گودوں میں رہیں۔ اور میں اپنے بچوں کی صورتوں کو ترسوں۔ اولاد والو۔ میری ممتا کی قدر کرو اور میری حالت دیکھو۔ میری دودھ چُھٹی تنویر جس کی تصویر میری آنکھ کے سامنے ہے۔ میرا پیارا ناصر اور میرا چاند نصرت۔ آہ سب مجھ سے جُدا ہو گئے۔ اپنے بچّوں کا واسطہ میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دو"۔

زائرہ کی گفتگو سے سب لرز گئے۔ فضل نے اسی وقت پینس منگوائی بچّی کو سوار کیا اور اسلم کو ساتھ کیا۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ جب زائرہ سسرال پہنچی۔ تنصیر باہر آیا تو زائرہ نے کہا "میرا قصور معاف کرو۔ میں لونڈی تھی۔ مجھ سے قصور ہُوا۔ میرے بچوں کی صورتیں مجھے دکھا دو"۔

تنصیر نے بیوی کو جواب نہ دیا۔ اسلم سے کہا اتار لایئے۔ اسلم نے بہن کو اُتارنے کی کوشش کی۔ روشنی منگوائی۔ مگر اترنے سے پہلے زائرہ کی

روح عالمِ بالا کو پرواز کر چکی تھی ۔

زائرہ کی خبرِ موت سنتے ہی خدیجہ دروازے پر آئی ۔ آج اس کو معلوم ہوا کہ جنتی بہو اُس کے پاس ہمیشہ رہنے والی نہ تھی ۔ اپنے ہاتھ سے مردے کو اُتارا اور گود میں لے کر اندر گئی ۔ اب اس کا صبر اور خاموشی رہ رہ کر کلیجے پر بجلیاں گرا رہے تھے ۔ اس وقت میاں کو بھی خیال آیا کہ بیوی چند روز کی مہمان تھی ۔ جو ہر طرح کے ظلم اور سب قسم کی مصیبتیں میرے ہاتھوں بھگت گئی ۔ دونوں ماں بیٹے اس کے صبر کو یاد کر کے رو رہے تھے ۔ کہ خدیجہ کا دل بھر آیا ۔ وہ جھکی اس نے چہرہ کو پیار کیا ۔ اور کہا ” کس مُنہ سے کہوں ۔ آدمی نہیں فرشتہ اور بہو نہیں ہیرا تھی ۔ دس برس کی بیاہی ۔ چھ بچوں کی ماں ۔ آج تک اُلٹ کر جواب نہ دیا ۔ جو کہا چپکی کھڑی سُنتی رہی ۔ اے بیگم میرا قصور معاف کیجو “ قمر کی اناّ مُردے کے پاؤں گری اور کہا ” میں نے چوری کا الزام رکھا سب میری طرف ہو گئے ۔ کیا بے کسی کی حالت تھی ۔ آنکھ سے آنسو جاری تھے ۔ اور حسرت سے ایک ایک کا مُنہ تک رہی تھیں ۔ جب میاں خفا ہوئے ہیں ۔ تو ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو گئیں ۔ اے بی بی ۔ میں لونڈی ہوں مجھے معاف کر “ تنصیر کی ہچکی بندھی ہوئی تھی ۔ اور آج اس وقت اس کی گریہ وزاری اس مثل کو اصل کر رہی تھی کہ جیتے سیتا موئے دھڑا دھڑ پیٹا ۔ ماں سے کہنے لگا ” میں وہ بدنصیب ہوں جس نے اس لال کی قدر نہ کی ۔ رات دن میری خدمت اور اطاعت کرتی رہی ۔ بخار چڑھا ہوا ہے ۔ درد ہو رہا ہے ۔ مگر میرے کاموں میں فرق نہ آنے دیا ۔ پنکھے جھلے اور اُف نہ کی ۔ پاؤں دبائے اور تیوری پر بل نہ آیا ۔ میرا گھر برباد اور میرے بچے بن ماں کے ہوئے جس روز ڈولی میں آئی ہیں ۔ کس حسرت سے کہا ہے کہ خدارا

بچّوں کی صورت دکھادو۔ مگر میں نے ڈولی لوٹا دی اور بچّوں سے نہ ملنے دیا"
زائرہ بیگم۔ تو جنتی تھی۔میں دوزخی۔ تو مظلوم میں ظالم۔ میری غلطیوں سے
درگذر کر قیامت کے روز مجھ سے مواخذہ نہ کیجیو"
اسلم نے جب جاکر باپ کو بہن کی خبر سنائی۔ تو اُس نے ایک چیخ
ماری اور یہ کہہ کر گر پڑا:۔
"بیٹی ظالم باپ سے بالکل ہی خفا ہوگئیں"۔
خدیجہ اور نصیر کا رنج روز بروز کم اور افضل کا صدمہ لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتا
گیا۔ اس کو جس وقت یہ خیال آتا کہ میں نے دولت کے لالچ میں بے گناہ
اور معصوم بچّی کو گھر سے نکالا۔ اور اس لئے کہ اس کا خرچ مجھ کو دوبھر تھا
قصائی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ تو لرز جاتا۔ تھرا اُٹھتا۔ دن رات وہ تھا
اور زائرہ کی یاد۔ ساری ساری رات اُسی اُدھیڑ بن میں گذر جاتی۔ دنیا عالم
خواب میں ہوتی۔ اور وہ اپنی حرکت پر لعنت اور فعل پر ملامت بھیجتا۔ نیند اُڑ
گئی تھی بھوک بھی بند ہوگئی۔ اب اس کی زندگی صرف اس توقع پر تھی کسی روز
خواب میں وہ صورت دیکھ لوں جو ہاتھوں سے زمین میں چھپا دی۔ اس کی باتیں
یاد کرتا اور چیختا۔ اس کے صبر کا خیال کرتا اور روتا۔ اس کی چیزیں دیکھتا اور
بلکتا۔ جسم کے کپڑے جو تختے پر اتارے گئے تھے۔ سر پہ رکھتا آنکھوں سے
لگاتا اسی طرح وہ ایک روز اس کے کاغذوں کا بستہ ٹٹول رہا تھا۔ جس میں
سے یہ مضمون نکلا:۔
"میری زندگی ماں باپوں کے لئے عبرت اور ان ورثا کے واسطے جن کے
ہاتھوں میں لڑکیوں کے نکاح ہیں نصیحت ہوگی مسلمانوں کا موجودہ طریقہ نکاح
ہرگز قابل اعتراض نہیں۔ اگرچہ اندیشہ ضرور ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے

اپنی عقل مندی سے دوسری خوبیاں زائل کیں۔ اسی طرح کہیں وہ اس طریقے کو بھی قابلِ نفرین اور لایق ملامت نہ بناویں + تاہم مجھے اُمید ہے۔ کہ میری زندگی اس جھگڑے کو پاک اور موت اس مسئلے کو صاف کردے گی + میرے والدین کی یہ توقع کہ میں دولتمند ساس کی بہو۔ تابع دار شوہر کی بیوی۔ اور خوش حال گھر کی گھر والی بنوں۔ ان کی مامتا کا ثبوت اور محبت کا نتیجہ تھا وہ اس اعتبار سے یقیناً قابلِ ملامت نہیں مگر ہاں اُن سے جو غلطی ہوئی وہ یہ تھی۔ کہ گو انسانیت کے لحاظ سے میں اور نصیر دونوں ہم جنس تھے مگر خیالات کی یکسانیت میں اتنا بُعد المشرقین تھا۔ کہ دس سال کی متواتر کوششوں میں بھی ایک گھڑی چین کی نہ گزری + کہا جاتا ہے کہ بیوی اپنی خدمت سے شوہر کے دل میں گھر کرتی ہے۔ مگر میں خدا کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ میں نے اپنی طرف سے کسی کوشش میں کمی نہ کی۔ لیکن پتھر میں جونک نہیں لگتی۔ تل کا پہاڑ اور مٹیل کا بیل ممکن نہیں۔ اور جہاں سوئی رکھنے کی جگہ نہ ہو۔ وہاں قدم رکھنا محال ہے مگر اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ میں خود انتخاب کرتی + اس کا جواب یہ ہے کہ خدا مسلمانوں پر وہ وقت نہ لائے کہ لڑکیاں خود شوہر چھانٹیں۔ یہ کام ماں باپوں ہی کا ہے۔ اور وہی کریں مگر یہ سمجھ لیں کہ اس سے زیادہ ذمہ داری کا کام اس سے بڑھ کر اہم فعل دُنیا میں کوئی نہیں۔ بیٹیوں کا بیاہ گڑیوں کا کھیل نہیں۔ ایک زندگی کی فلاح۔ ایک خاندان کی تباہی اور ایک بے بس انسان کی تمام امیدیں اس سے وابستہ ہیں + مزاج کی موافقت۔ خیالات کی یکسانیت خواہشوں کی مطابقت اور ارادوں کا میل مقدم اور سب سے مقدم ہے۔ دولت اس کے مقابلے میں ہیچ زیور خاک اور چڑھاوا مٹی ہے + میری ماں مرچکی۔ اور اس کی پاک روح اس وقت وہاں ہے جہاں اب میں

جانے کو تیار رہوں۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ اماں جان کی روح مجھ سے شرمندہ ہو + ان کی نیت بخیر تھی اور جو غلطی اُن سے ہوئی۔ مجھے اب کہ میری زندگی ختم مصیبتیں بند اور تکلیفیں پوری ہوئی ہیں۔ ان سے کوئی شکایت نہیں + ابّا جان زندہ ہیں۔ مگر میرا دل کہہ رہا ہے کہ میری موت ان کو زندہ نہ رکھے گی + اُنہوں نے جو کچھ کیا۔ میری بہتری کے واسطے + میرا فرض یہی تھا کہ اُنہوں نے مجھ کو جس شخص کے سپرد کیا۔ اس کو سرتاج سمجھتی۔ سو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں نے اپنا فرض پورا اور اپنا کام مکمل کیا۔ میری زندگی ہر لغزش سے پاک اور میرا دامن ہر اعتراض سے صاف ہے + مجھ پر جو گزرنی تھی گزر گئی۔ مگر میں نے ماں باپ کی آبرو پر حرف نہ آنے دیا + میرا منشا یہ نہیں ہے۔ کہ میں قیامت کے روز اپنے خون کا اُن سے مواخذہ کروں۔ میرے بازو کا درد جو نصیر کے دھکے سے شروع ہوا اور میری جان کے ساتھ جائے گا۔ میری اپنی تقدیر تھی۔ میں اپنے باپ سے خوش و خرّم رخصت ہوتی ہوں اور اس لئے کہ ان کی نیّت میں خرابی نہ تھی۔ اُن کی غلطی قابلِ عفو ہے :+

میں اُن تمام مسلمانوں کو جو یہ تحریر دیکھیں۔ گواہ کرتی ہوں کہ میں نے اپنا مہر نصیر پر معاف کیا + بچے میرے نہیں۔ اس کے ہیں۔ میرے ہوتے تو اس وقت میرے کلیجے سے چمٹے ہوتے۔ خدا اُس کو نصیب کرے + تنویر اگر زندہ رہے تو یہ انگوٹھی جو بستے میں موجود ہے۔ ماں کی آخری نشانی اس کے دولھا کو دے دینا۔ لڑکوں کو ماں کا یہ پیغام پہنچا دینا۔ کہ بدنصیب ماں تمہارے چاند سے ٹکھڑوں کو ترستی ہوئی دُنیا سے اُٹھ گئی۔ خدا تمہاری عمروں میں برکت دے۔ ماں کو فراموش نہ کرنا اور اگر دُنیا کے جھگڑے فرصت دیں۔ تو کبھی کبھار قبر پر آکر فاتحہ پڑھ لیا کرنا :+